اردو کی اوّلین نسوانی خود نوشت

بیتی کہانی

مرتبہ

معین الدین عقیل

بیتی کہانی

اردو کی اوّلین نسوانی خود نوشت اور تاریخِ پاٹودی کا ایک بنیادی مأخذ

مصنفہ

شہر بانو بیگم

(دختر نواب اکبر علی خاں، رئیس پاٹودی)

مقدمہ اور تعلیقات

معین الدین عقیل

اشاعتِ اوّل : ۱۹۹۵ء
ناشر : ادارۂ علمی حیدر آباد، پاکستان
اہتمام : محمد عقیل شاد، شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، پاکستان۔
طابع : الائیڈ پرنٹنگ کارپوریشن، حیدر آباد
قیمت : ۱۷۵ روپے

درجہ بندی اور کیٹلاگنگ کے لیے تفصیلات :

شہر بانو بیگم
اردو کی اولین نسوانی خود نوشت : بیتی کہانی
مرتبہ : معین الدین عقیل (۱۹۳۶ء۔)
مقدمہ۔ حواشی و تعلیقات۔ فہرستِ اسنادِ محولہ۔ اشاریہ
۱۔ جنوبی ایشیا۔ انیسویں صدی۔ طبقۂ نسواں ۲۔ طبقۂ نسواں۔ برطانوی ہند۔ مسلم ریاستیں ۳۔ برطانوی ہند۔ مسلم ریاستیں۔ طبقۂ نسواں ۴۔ اردو زبان۔ خود نوشت سوانح عمری۔ طبقۂ نسواں

۔ سرورق ب۔ عقیل، معین الدین
۱۹۹۵ء

رفیقۂ حیات کے نام

خیالِ ما کہ او را پرورش دادند طوفاں ہا
زگردابِ سپہرِ نیلگوں بیروں شود روزے

مندرجات

اردو کی اوّلین نسوانی خود نوشت

"بیتی کہانی"

اردو میں تخلیقی خود نوشت سوانح عمری کی مستقل روایت کا آغاز انیسویں صدی کے آخری عشروں کا واقعہ ہے۔ قبل ازیں اس کی تخلیق ضمنی و متعلقہ اصناف میں ملتی ہے۔ مثلاً سفر نامے، جن میں مصنفین واقعات و مشاہداتِ سفر کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے جستہ جستہ حالات بھی کہیں اختصار یا کہیں طوالت کے ساتھ بیان کرتے رہے ہیں۔ لیکن سفرنامے کی تخلیق مقصد اور نوعیت کے اعتبار سے خود نوشت سوانح عمری کے ذیل میں نہیں لائی جا سکتی۔ روزنامچے یا حوادث و واقعات پر مشتمل یادداشتیں بھی اس زمرے میں نہیں آتیں کہ یہ مصنف کی مربوط و مکمل سوانح عمری کا احاطہ نہیں کرتیں۔ اردو تذکرہ نگاروں نے جہاں ماقبل عہد اور معاصرین کے حالات اپنے تذکروں میں تالیف کیے، بعض نے خود اپنے احوال کو بھی اس میں شامل کیا، لیکن اس کا اختصار اور معلومات کی تشنگی اسے سوانح عمری کی معروف اور متفقہ تعریف کے تحت اس صنف میں شمار کیے جانے سے دور رکھتے ہیں۔ اردو شاعروں اور مصنفوں کی وہ خودنوشت سوانح عمریاں بھی، جو فارسی زبان میں لکھی گئیں، اردو میں تخلیق نہ ہونے کے باعث ہمارے موضوع میں نہیں آتیں۔

ان اصناف اور تخلیقی و تصنیفی نوعیتوں سے قطع نظر، اُردو میں خودنوشت سوانح عمری، اس موضوع پر تفصیلی و خصوصی مطالعہ کرنے والے مصنفین و محققین کے مطابق، ۱۸۶۰ء سے قبل نہیں لکھی گئی۔ اس ضمن میں زیادہ سے زیادہ عبدالغفور نساخ (۱) اور جعفر تھانیسری (۲) کی تصنیف کردہ اُردو کی اولین خودنوشت سوانح عمریاں

بتائی جاتی ہیں ۔ جو ۱۸۸۶ء میں لکھی گئیں ۔ جب کہ پتمبر سنگھ (۳) اور سیّد رجب علی (۴) کی خودنوشت تاحال اس موضوع پر کام کرنے والے محققین اور مؤرخینِ ادب کے پیش نظر نہ آ سکیں، اس اعتبار سے پتمبر سنگھ کی تحریر کردہ خودنوشت کو اُردو کی اوّلین خودنوشت کہا جانا چاہیے۔ اسی طرح ایک اور خودنوشت سوانح عمری ، اب تک منظر عام پر نہ آنے کے باعث ، کسی کی توجہ حاصل نہ کر سکی ۔ اسے شہر بانو بیگم نے " بیتی کہانی " کے عنوان سے مئی ۱۸۸۵ء میں تصنیف کیا تھا اور قریبًا ڈیڑھ سال بعد اس میں محض دیباچے کا اضافہ کر کے اِسے کتابی شکل دی ۔ اس لحاظ سے اسے نسّاخ اور جعفر تھانیسری کی مذکورہ تصانیف سے قبل تخلیق میں آنے والی اور اوّلین نسوانی خودنوشت سوانح عمری کہا جانا چاہیے (۵) ۔

اس تصنیف کی اہمیت صرف اس قدر نہیں کہ یہ اردو کی اوّلین خود نوشت سوانح عمریوں میں سے ایک ہے ۔ اس عہد میں کہ ہندوستانی خواتین میں حصول علم اور تصنیف و تالیف کا ذوق ابھی عام نہیں ہو سکا تھا اور اپنے ابتدائی و تشکیلی مرحلے میں تھا ، کسی خاتون کا تصنیف پر آمادہ ہونا اور پھر ایک ایسی صنفِ ادب کو اختیار کرنا جو اس وقت عام نہیں تھی ، ایک قابل توجہ امر ہے ۔ پھر اس خاتون کی یہ خود اپنی اولین تخلیق اور تصنیفی کاوش بھی ہے اور یہ بھی ایک تعجب خیز امر ہے کہ اس خاتون کی تعلیمی استعداد ، باوجود اس کے کہ اس کا تعلق ریاست پاٹودی کے حکمراں خاندان سے تھا اور وہ رئیسِ ریاست نواب اکبر علی خاں (۱۸۱۳ء ۔ ۱۸۶۲ء) کی دختر تھی، بہت معمولی اور واجبی تھی۔ مصنفہ نے یہ خودنوشت ایک ایسی انگریز خاتون مس فلیچر (Miss Fletcher) کی فرمائش پر تصنیف کی اور اسے پیش کی ، جس سے اس کا ربط و تعلق ایک ہمسبق کا سا تھا ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد ریاستوں کی بربادی اور زندگی کے مختلف نشیب و فراز اور زیادہ تر تکلیف دہ حالات سے گزر کر مصنفہ نے اس خودنوشت کی تصنیف کے وقت دہلی کو اپنا مسکن اور محض دل بہلانے کے لیے اس انگریز خاتون کے ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ شروع کیا۔ مصنفہ اس کو اُردو بولنا

سکھاتی اور وہ مصنفہ کو لکھنا اور پڑھنا سکھاتی ۔ یوں اسی مشغلے کے دوران " بیتی کہانی " بھی وجود میں آئی ۔ اس شغل سے بھی مصنفہ کی تعلیمی لیاقت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی اس خودنوشت کے مخطوطے میں مصنفہ کی املا کو دیکھ کر یہی رائے قائم ہوتی ہے، کیونکہ کئی مقامات پر املا کی غیر معروف صورتیں، جن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے، نظر آتی ہیں۔ لیکن اس سقم کے باوجود مصنفہ کی زبان اور اس کا اظہار نہایت شگفتہ ، سلیس و رواں اور روزمرہ و محاورہ سے آراستہ ہے۔ زبان اور نثر کی خصوصیات ہی پر اگر نظر رکھی جائے تو اس کی دل نشینی اور جاذبیت مصنفہ کے خاندانی پس منظر اور اس کے ماحول کی مناسب ترجمانی کرتی ہیں۔

مصنفہ نے اپنی اس خودنوشت میں اپنی پیدائش (۱۸۳۸ء) سے لے کر اس تصنیف پر نظر ثانی (جنوری ۱۸۸۰ء) تک تقریباً چالیس سالوں کا احاطہ کیا ہے۔ اس خودنوشت کی تصنیف کے بعد مصنفہ کے حالات کا علم نہیں ہوتا۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد ، انگریزوں کے ساتھ تعاون کے نتیجے میں ریاست پاٹودی برقرار رہی اور اس کے اس وقت کے رئیس ، مصنفہ کے والد نواب اکبر علی خاں کے انتقال (۱۸۶۲ء) کے بعد نوابی کا تسلسل ان کے اخلاف میں کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے ، لیکن مصنفہ کے بعد کے حالات کا کسی ذریعے سے کوئی علم نہیں ہوتا۔ اور اس صورت میں کہ خود ریاست پاٹودی اور اس کے نوابین کے بارے میں کسی مستقل مأخذ کے نہ ہونے اور محض منتشر اور ناکافی معلومات کی دست یابی کے باعث ریاست کے عہد مابعد کے حالات میں ایسی کسی خاتون کے بارے میں معلومات کے کسی مستقل ماخذ کی توقع یوں بھی سود مند نہیں ہو سکتی ۔ خود ریاست کسی اعتبار سے اہم نہ تھی۔ اگرچہ ریاست کے حکمراں نواب کہلاتے تھے، لیکن کوئی سند نہیں کہ باقاعدہ انھیں کبھی یہ خطاب ملا تھا۔ اس کا کل رقبہ ۵۳ مربع میل اور اس کی کل آبادی ، مثلاً انیسویں صدی کے اختتام تک بیس ہزار سے زائد کبھی نہ رہی ، یہاں تک کہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس ریاست کی کل آبادی ۲۱۵۲۰ تھی۔ اور اس کا

مرکزی شہر، جو اسی نام سے موسوم رہا ہے، بیسویں صدی کے آغاز میں چار ہزار نفوس کی آبادی کا شہر تھا۔ اس شہر کے علاوہ ریاست کی کل متاع چالیس گاؤں پر مشتمل تھی۔ پوری ریاست میں صرف ایک ہسپتال، ایک پرائمری اسکول اور چار دیہی مدرسے تھے۔ ریاست کی کل آمدنی انیسویں صدی میں غالباً دو لاکھ روپے تک بھی کبھی نہ پہنچ سکی۔ ۱۸۹۱ء میں اس کی کل مالگزاری کی رقم ۶۶۳۱، روپے طے کی گئی تھی اور زرِ محصولات سالانہ صرف ۷۵۰ روپے حکومت برطانیہ کو ادا کیا جانا تھا (۶) پیداوار میں غلہ جات، روئی، نیشکر اور زعفران شامل تھے (۷)۔ غیر اہم ہونے کے باعث اس کا ذکر تاریخ کے صفحات سے تقریباً خارج رہا ہے (۸) اور اگر کسی نے کچھ ذکر کیا بھی ہے تو وہ حاشیوں یا چند سطروں سے زیادہ نہیں۔ اس صورت میں زیرِ نظر "بیتی کہانی" ریاست اور اس کے حکمرانوں کے بارے میں جو معلومات فراہم کرتی ہے، وہ اس موضوع پر کسی مستقل مأخذ کی غیر موجودگی میں ایک بنیادی، چشم دید اور راست مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مصنفہ نے جو کچھ اپنے اسلاف کے بارے میں تحریر کیا ہے، اس کے مطابق اس ریاست کے بانی مصنفہ کے دادا، نواب فیض طلب خاں (متوفی ۱۸۲۹ء) اصلاً پٹھان تھے، لیکن ان کے بزرگ "شیخان" کہلاتے تھے۔ کیوں کہ ان کا سلسلۂ نسب اپنے وقت کے معروف صوفی رکن الدین محمود (۹) سے ملتا ہے، جو نیشاپور کے جوار میں ایک موضع خواف کے رہنے والے تھے۔ یہ حضرت مودود چشتی (۱۰) کے خلفاء میں سے تھے۔ اپنی بزرگی اور اپنی کرامات کے سبب رکن الدین محمود "خواجہ شیخاں" کہلاتے تھے اور حضرت مودود چشتی نے انھیں "شاہ شیخاں" کا لقب عطا کیا تھا۔ مصنفہ نے اس ضمن میں "نفحات الانس" اور "سیر الاقطاب" سے متعلقہ عبارتیں نقل کی ہیں۔ شیخ رکن الدین محمود کی بارھویں پشت میں ایک بزرگ شیخ لالہ حسن گذرے ہیں، جنھوں نے شہر سمانہ کے قریب ایک گاؤں مراد پورہ کو اپنا مسکن بنایا تھا اور "پیر ماتھا" اور "زندہ پیر" کی حیثیت میں شہرت پائی تھی۔ انھوں نے ۱۵۶۵ء میں وفات پائی۔ نواب فیض طلب خاں کا سلسلہ انھی سے ملتا ہے۔ مصنفہ نے اس سلسلے کی جو تفصیلات تحریر

کی ہیں۔ ان کے مطابق درج ذیل شجرہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔
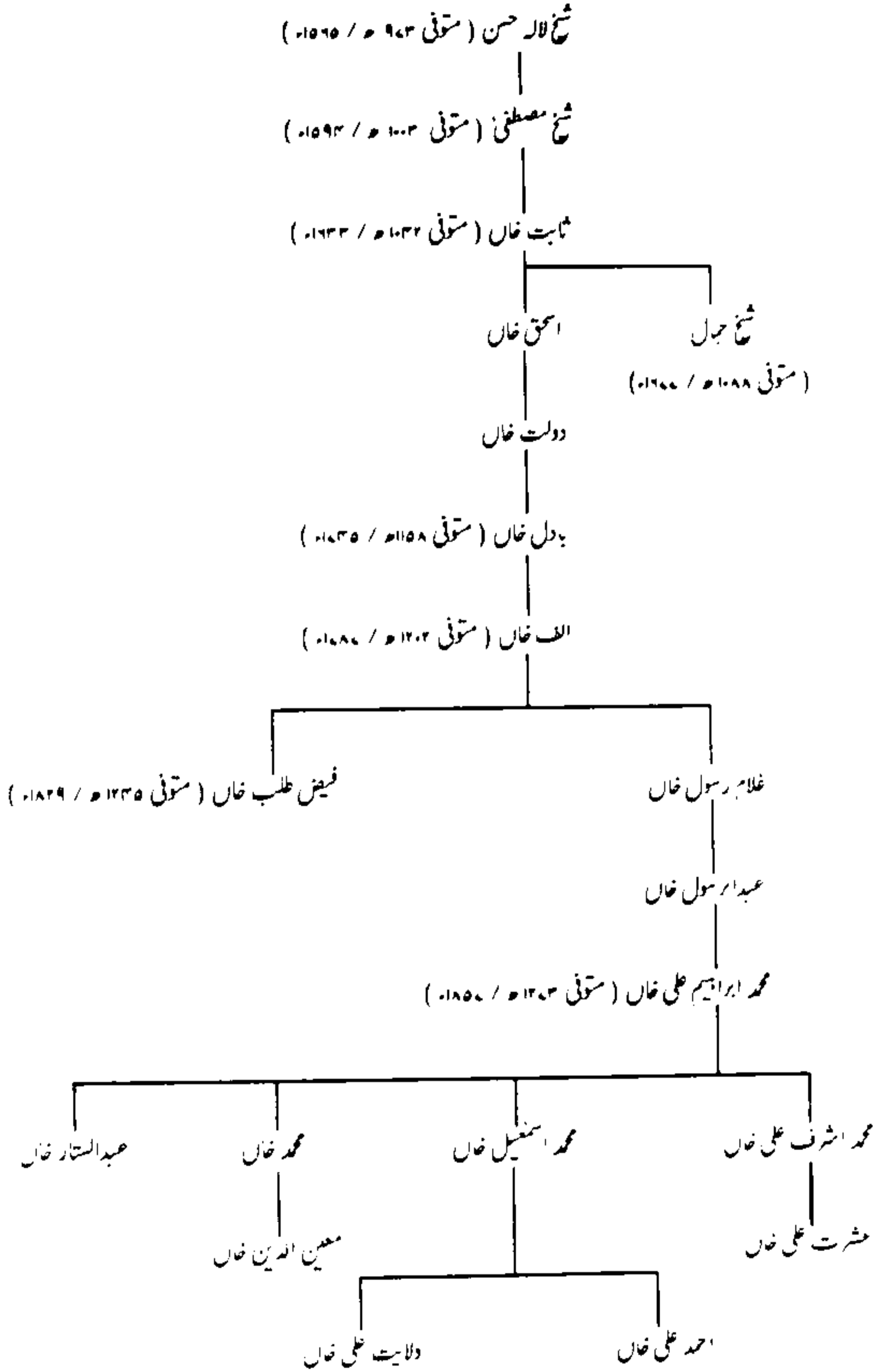
نواب فیض طلب خاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے بہادر اور جری انسان تھے۔ (۱۱) یہ اور جنرل پیردن (PERRON)۔ (۱۷۵۵ء - ۱۸۳۴ء) (۱۲) اور پھر لارڈ جیرارڈ لیک (GERARD LAKE) (۱۷۴۴ء - ۱۸۰۸ء) کی ملازمت میں رہے۔ جسونت راؤ ہلکر (۱۷۹۰ء - ۱۸۱۱ء) کے مقابلے میں ایک معرکے میں بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ان خدمات کے صلے میں انھیں جاگیر میں پاٹودی عطا کی گئی۔ یہ نواب نجابت علی خاں کے دوست تھے اور ان کی شادی نجابت علی خاں کی بہن سے ہوئی تھی (۱۳)۔ نجابت علی خاں، شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء - ۱۸۰۶ء) کے عہد میں جاگیردار اور قدر و منزلت کے حامل تھے۔ ان کی جواں مردی کے سبب مادھوراؤ سندھیا (۱۷۶۱ء-۱۷۹۴ء) نے بھی، جب دلی پر اس کا تسلط قائم ہوا تو ان کی حیثیت برقرار رکھی۔ نجابت علی خاں نے سندھیا کے ساتھ پرتاب سنگھ کچھوا (۱۷۷۸ء - ۱۸۰۳ء) پر حملے میں بڑی دلیری کے ساتھ حصہ لیا۔ چنانچہ اس کے صلے میں سندھیا نے شاہ عالم سے انھیں "اسدالدولہ، ممتاز الملک، ہزبر جنگ" کا خطاب دلوایا اور خود پرگنہ رُہتک اور چند گاؤں انعام میں دیے، جو ریاست جھجر میں شامل ہوئے (۱۴) نواب فیض طلب خاں ان کے ساتھ مختلف معرکوں میں شامل رہے۔ ۱۸۰۳ء میں دلی پر انگریزی عمل داری کے بعد یہ دونوں انگریزوں کی خیر خواہی میں رہے اور ۱۸۰۴ء میں ہلکر کے ساتھ انگریزوں کی معرکہ آرائی میں شریک رہ کر بہادری کا ثبوت دیا۔ چنانچہ صلۂ خدمت کے طور پر نواب نجابت علی خاں نے جاگیر سابقہ کی سند اور محالات جھجر اور کانونڈ اور نواب فیض طلب خاں نے پاٹودی کا پرگنہ حاصل کیا۔ (۱۵)

دوستی اور رشتے داری کی نسبت کے باعث پاٹودی اور جھجر میں بالعموم قرابت داری رہی۔ اگرچہ ۱۸۰۸ء میں نواب فیض طلب خاں کی اہلیہ اور نواب نجابت علی خاں کی ہمشیرہ کے انتقال کے باعث یہ رشتہ حسب سابق نہ رہا۔ نواب فیض طلب خاں نے اپنی اہلیہ کے انتقال کے بعد ۱۸۰۹ء میں الہ آباد میں مقیم سادات نیشاپور کے ایک خاندان میں حکیم میر عبداللہ کی دختر سے شادی کی، جن کے بطن سے مصنف کے

والد نواب اکبر علی خاں ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ دونوں ریاستوں کے درمیان نواب نجابت علی خاں کے انتقال (۱۸۱۴ء) کے بعد ان کے جانشین نواب فیض محمد خاں (۱۶) سے نواب فیض طلب خاں کا تنازع پیدا ہوا۔ چنانچہ نواب فیض طلب خاں نے ریاست جھجر سے اپنے تعلقات ختم کر لیے (۱۷)۔ یہ تعلقات پھر اس وقت مستحکم ہوئے جب نواب اکبر علی خاں نے رئیس جھجر نواب فیض محمد خاں کے انتقال کے بعد مسند نشینی کے مناقشے میں نواب فیض محمد خاں کے فرزند نواب عبدالرحمان خاں (۱۸) کی بحیثیت رئیس جھجر مسند نشینی میں معاونت کی (۱۹)۔ یہ روابط اس حد تک استوار ہوئے کہ جب اس خود نوشت کی مصنفہ پیدا ہوئی، اسی دن (۵ ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ۔ ۱۸۴۸ء) نواب عبدالرحمان خاں نے اپنے فرزند محمد نور علی خاں کے ساتھ اس کی نسبت طے کر دی۔ ان دونوں نوابین کے مابین دوستی ۱۱ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو بغاوت کے جرم میں نواب عبدالرحمان خاں کی گرفتاری اور ان کے پھانسی پانے اور ریاست جھجر کے خاتمے تک برقرار رہے۔ (۲۰)

نواب اکبر علی خاں کا رویہ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ اور مفاہمانہ رہا، اس لیے ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی ریاست برقرار رہی۔ اس دوران پاٹودی (اور جھجر) میں پیش آنے والے واقعات کو مصنفہ نے تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ (۲۱)

نواب اکبر علی خاں نے بارہ شادیاں کیں، جن سے اولاد میں پانچ بیٹے اور بارہ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ مصنفہ نے ان کی جو تفصیلات بیان کی ہیں، ان کے مطابق نواب اکبر علی خاں کے فرزندوں کا یہ شجرہ ترتیب پاتا ہے۔

نواب فیض طلب خاں (متوفی ۱۸۲۹ء)
نواب اکبر علی خاں (۱۸۱۳ء ۔ ۱۸۹۲ء)
محمد تقی علی خاں (متوفی ۱۸۹۰ء)(۲۲)
محمد اصغر علی خاں (متوفی ۱۸۶۰ء)(۲۳)
لاولد
محمد جعفر علی خاں (متوفی ۱۸۶۹ء)
محمد صادق علی خاں (۲۶)
محمد عنایت حسین خاں (۲۸)
محمد حبیب الرحمن خاں (۲۰)
محمد حسن خاں
محمد حسین خاں
مظفر علی خاں (۲۴)
وصیت علی خاں (۲۵)
محمد مختار حسین علی خاں
(۱۸۵۶ء ۔ ۱۸۶۸ء)
محمد ممتاز حسین خاں
(ولادت : ۱۸۶۳ء) (۲۹)
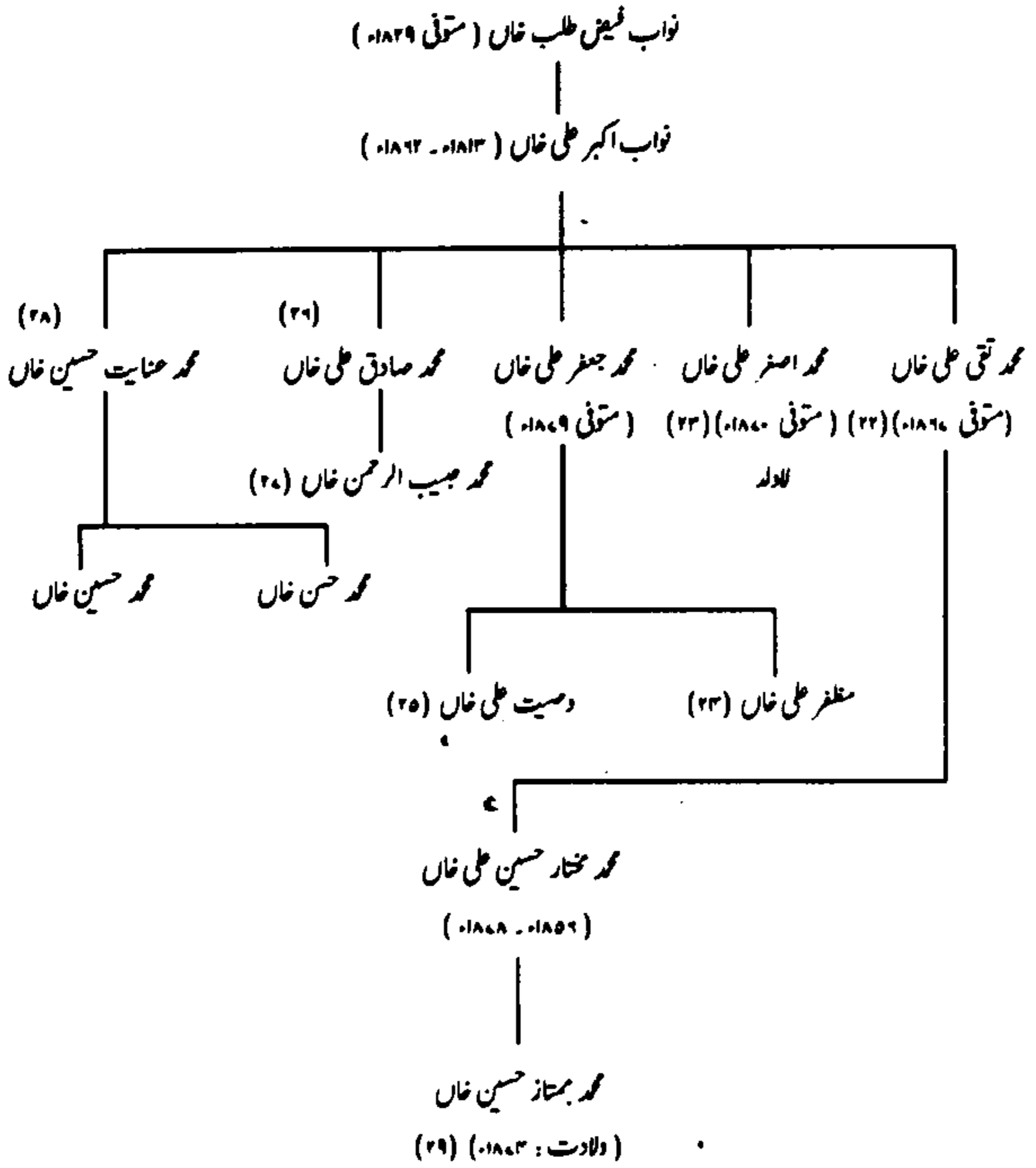
نواب محمد ممتاز حسین خاں کے انتقال (۱۸۹۸ء) کے بعد نواب مظفرؔ علی خاں (۱۸۶۳ء۔۱۹۱۳ء) ان کے جانشین ہوئے (۳۰) اور ان کے بعد ان کے فرزند محمد ابراہیم خاں (۱۹۱۳ء۔۱۹۱۷ء) رئیس پاٹودی ہوئے۔ ان کے دو فرزند نواب افتخار علی خاں (۱۹۱۰ء۔۱۹۵۲ء) اور نوابزادہ شیر علی خاں (ولادت۔ ۱۹۱۳ء) میں سے اوّل الذکر نے ریاست کے اختیارات سنبھالے۔ لیکن تقسیمِ ہند(۱۹۴۷ء) کے بعد انھوں نے رضاکارانہ طور پر اپنی ریاست کو " انڈین یونین " میں ضم کرنے کی پیش کش کر دی۔ چنانچہ ۱۸ مارچ ۱۹۴۸ء کو اِدغام کے معاہدے پر دستخط ہو گئے اور ریاست کی سابقہ حیثیت کا خاتمہ ہو گیا (۳۱)۔ اب جو بھی اس کی حیثیت ہے، اس کی امارت پر نواب افتخار علی خاں کے انتقال ۱۹۵۲ء کے بعد ان کے فرزند نواب منصور علی خاں (ولادت۔۱۹۴۱ء) فائز ہیں۔

مصنفہ رئیس جھجرؔ (نواب عبدالرحمان خاں) کے فرزند محمد نور علی خاں سے بیاہی گئی تھیں۔ چنانچہ ریاست کے خاتمے کے بعد نواب جھجرؔ کے سارے خاندان کے ساتھ وہ بھی تباہ حال ہوئیں اور دربدر ہو کر زندگی نہایت عسرت و تنگ دستی میں گزارنے پر مجبور ہو گئیں ۔ ان کے شوہر نے ایک نا اہل و ناکارہ اور ایک بگڑے نواب کے کردار کی مثال پیش کی اور اپنا رہا سہا اثاثہ لٹا دینے کے بعد بیوی کے نہایت قلیل وظیفے پر، جو ریاست پاٹودی کے ورثاء کے لیے منظور ہوا تھا، انحصار کیا۔ ۱۸۷۱ء میں اس کا بھی انتقال ہو گیا ۔ جس کے بعد مصنفہ نے اپنی مستقل علالت کے باعث لدھیانہ کی سکونت ترک کرکے، کہ ریاست جھجر کے خاتمے کے بعد نواب جھجرؔ کے سارے خاندان کو جھجرؔ سے نکال کر جبراً وہاں منتقل کر دیا گیا تھا، ــــ بہ ہزار کوشش دہلی میں قیام کی اجازت حاصل کی اور وہاں منتقل ہو گئیں۔ یہاں ان کی ملاقات ایک نسوانی ڈاکٹر مِس تھورن (MISS THORN) کے توسط سے مِس فلچر سے ہوئی، جس کی فرمائش پر مصنفہ نے " بیتی کہانی " تصنیف کی۔

مصنفہ کی تعلیمی لیاقت واجبی ہونے کے باوجود زبان نہایت

شگفتہ ، سلیس و رواں ہے اور ضرب الامثال و محاوروں کے بے تکلفانہ استعمال سے اس میں حد درجہ دل کشی و جاذبیت پیدا ہوئی ہے۔ اس پر دہلوی روزمرہ کا اثر خاصا واضح ہے۔ یہ مخصوص خاندانی اور گھریلو ماحول ہی تھا کہ مصنفہ نے اپنی تعلیمی کم استعدادی کے سبب تحریر میں املا کی غلطیاں تو روا رکھیں، لیکن ـــــ زبان کے استعمال اور جملوں کی ترتیب اور الفاظ کی نشست و برخاست کو عین فطری انداز دیا ہے کہ اظہارِ بیان کی بے ساختگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ املا کی جو اغلاط مخطوطے میں ملتی ہیں، وہ اس طرح کی ہیں:

اسرار	بجائے	اصرار
اساسہ		اثاثہ
تشنیہ		تشنیع
نواہ		نواح
زیق		ضیق
نارا		نعرہ
دستر خان		دستر خوان
خطنہ		ختنہ
کپڑہ		کپڑا

بعض مقامات پر افعال اور اسماء وغیرہ کو توڑ کر بھی لکھا ہے جیسے

پڑھ تی	پڑھتی
کڑک تی	کڑکتی
کہاں نی	کہانی
بی وی	بیوی

کہیں کہیں جمع کے قاعدوں سے بھی بے نیازی برتی ہے مثلاً

باتیں چیتیں	بات چیت
بیگماتوں	بیگمات

بعض الفاظ کو، یوں لگتا ہے خود مصنف نے اپنے انداز میں استعمال کیا ہے۔

جیسے: عمری سرگزشت بہ جاے سرگزشت عمر یا سوانح عمری

چند الفاظ کو ان کے قدیم لہجے کے مطابق ...... تحریر کیا گیا ہے، مثلاً

لوں — لو

چونکی دار — چوکی دار

اسی طرح کہیں "اوس" اور "اون" لکھا ہے اور کسی جگہ "اس" اور "ان" بھی تحریر کیا ہے۔ روزمرہ، ضرب الامثال اور محاوروں کا جو استعمال اس میں ملتا ہے، وہ نہایت جاذبِ توجہ ہے۔ کئی ایسے محاورے اور ضرب الامثال مصنف نے استعمال کیے ہیں، جن میں سے بعض عام طور پر برتنے میں نہیں آتے۔ مثلاً

آنکھوں پر ٹھیلری رکھنا

بانکے دھاڑے تشنگی مارے

پٹکی پڑنا

ٹالے بالے بتانا

ٹکڑے اڑانا

جھوٹے ہاتھ مارنا

چھری کو پائیں ان کو نہ پائیں

چھو چھو مانی ہاتھوں چھاؤنی

چیتا کرنا

دل پھریری لینا

رات الٹنا

زہرا پھٹا جانا

سو سو من کی ایک سوم

شکلیں سر ہونا

قصے جھونا

کل جنی کا ٹو کا لگنا

کلیجے میں آبلے پڑنا

کھیت رہنا

کھیڑے بسانا

کھوجرا کھونا

ہزار کنشگوں کی ایک کنشگ

زبان کی ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ مصنفہ کا شعری ذوق بھی خاصا تعجب خیز ہے۔ اپنی بات کی معنویت کے لحاظ سے برمحل اشعار کا استعمال جگہ جگہ نظر آتا ہے ۔ اور یہ بھی توجہ طلب امر ہے کہ یہ اشعار زبان زدِ عام اور معروف اساتذہ کے نہیں ۔ مصنفہ کی نثر پڑھتے ہوئے یہ یقین رہتا ہے کہ اس کی زبان اور اظہار فطری ہے ، اکتسابی نہیں ۔ اس نے چونکہ یہ ساری سرگزشت مِس فلیچر کی فرمائش پر قلم بند کی ، اس لیے دوران سرگزشت بعض مقامات پر مصنفہ نے اس کو "بوا" کہہ کر مخاطب کیا ہے اور پھر اپنی سرگزشت جاری رکھی ہے ۔ اردو خودنوشت میں تخاطب کی مثال شاید ہی کہیں اور ہو ۔ زبان کے استعمال میں روایتوں اور روزمرہ کا لحاظ ، جو مصنفہ کی نثر میں واضح ہے ، اس وقت ایک عام صفت تھی ۔ اسی طرح مقفّٰی عبارت کا اہتمام بھی گاہے گاہے مصنفہ کی نثر میں موجود ہے ۔ اس قسم کی چند مثالیں ، جن سے اس خود نوشت کی عام لسانی خصوصیات بھی نمایاں ہوتی ہیں ، یوں ہیں۔

"کبھی امیری دیتا ہے کبھی فقیری ۔ کہیں عزت بخشتا ہے کہیں حقیری "

"میری کہانی پڑھ کر تم کیا نفع پاؤ گی، رنج و غم کھاؤ گی، اپنا جی دُکھاؤ گی، اور کچھ حظ نہ اٹھاؤ گی"

"جوں ہی نوالہ منہ میں ڈالا، گولی بنا حلق میں پھنسا۔ کوئی رو دیا کوئی ہنسا۔"

"تدبیروں پر تدبیریں پائیں، دواؤں پر دوائیں بدلیں۔"

"بھلا میں عورت، پردہ نشین اور ایک بچہ اور وہ بھی تین مہینے کی جان۔ حواس باختہ عقل حیران۔ آگے عالم تنہائی، نہ پاس ماں نہ باپ نہ بھائی۔"

"زندگی کے دن پورے کرتی ہوں جو ایسے ایسے دکھ بھرتی ہوں۔"

"جینا وبال ہے رات دن اسی کا خیال ہے۔"

"دنیا بڑی مکار ہے، اس کا کیا اعتبار ہے۔ دیکھو ابتدا، میں مجھے کیا سبز باغ دکھایا، آخر کو کس طرح خاک میں ملایا۔"

"دنیا دل بستگی کا مقام نہیں، اس کا ایک جا قیام نہیں۔ اس پر گھمنڈ کرنا عین نادانی ہے، کیوں کہ سرائے فانی ہے، جو لوگ اس کا حظ اٹھاتے ہیں، عزت کے عوض میں ذلت پاتے ہیں۔ دنیا حسد کی جڑ ہے، بے ایمانی کا گھر ہے۔ جس نے دنیا کا لحاظ و پاس کیا، اس نے عقبیٰ کا ناس کیا۔"

ان آخری تین چار اقتباسات میں جو احساس کرب اور تلخی نظر آتی ہے، وہ جہاں ایک طرف مصنفہ کی زندگی کے ان تجربات کا نتیجہ ہے، جو اس نے اپنی تنگ دستی و تباہ حالی اور اپنوں بیگانوں سے ملنے والی اذیتوں اور مایوسی کے سبب حاصل کیے، وہیں یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ مصنفہ نے اپنے ان تلخ تجربات کو ان کی گہرائی اور شدت کے اعتبار سے محسوس کرتے ہوئے بیان کرنے کی بھی ایک پُرتاثیر کوشش کی

ہے ۔ یوں اس کی نثر کا یہ ایک مزید وصف بھی ہے۔

مصنفہ نے اگرچہ منظر نگاری کا اہتمام نہیں کیا ۔ لیکن جو کچھ جیسا دیکھا ، اپنے مشاہدے کو موزوں الفاظ و پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اسے منظر نگاری کی ایک مناسب صورت کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر ، جب اپنے شوہر کی تباہ حالی کا سن کر وہ دلی سے اپنے شوہر کے گھر لدھیانہ پہنچتی ہے ، تو اپنے اجڑے گھر کو جس حالت میں اس نے دیکھا اسے الفاظ کا یہ روپ دیا ہے :

"گھر کو جو دیکھتی ہوں تو عجب حال ہے۔ جیسے کوئی لوٹ کر لے گیا ۔ مکان کے صحن میں کیا دیکھتی ہوں کہ گھوڑے بندھے ہوئے ہیں ۔ ہر طرف کوڑے کرکٹ کے انبار لگے ہوئے ہیں ۔ لڑکی دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی ۔ کیوں کہ وہ دلی کے عمدہ مکان میں رہ کر گئی تھی ۔ وہاں دیکھا تو ایک ڈھنڈار مکان دیکھا ۔ خیر گھوڑے تو اسی وقت کھلوا کر باہر اصطبل میں بھیجے ۔ دالان میں جو گھسی تو دیکھتی کیا ہوں ، کوٹھری کے آگے ایک پلنگ بچھا ہے۔ اور اس پر ایک میلی کچیلی مٹی کے رنگ کی چادر کسی ہوئی ہے ۔ جس کے دیکھنے سے گھن آتی تھی۔ اس کے آگے ایک تخت بچھا ہے ۔ اس پر ایک میلا چکٹ دسترخوان کا چیتھڑا پڑا ہے۔ اس میں دو تین روٹیاں بیسنی خشک لپٹی دھری ہیں ۔ میں نے جانا کسی ماما اصیل کی روٹی رکھی ہے ۔ اور ایک کونے میں فتیل سوز رکھا ہے۔ اب ادھر دیکھتی ہوں ادھر دیکھتی ہوں ۔ فرش کا کہیں پتہ نہیں۔ الہٰی بیٹھوں تو کہاں بیٹھوں..."

یا ایک مقام پر جب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران پاٹودی پر تباہی آئی اور

حفاظت کی کوئی تدبیر نہ رہی تو اولاً رئیس پاٹودی، اور ان کے فرزند اور پھر خواتین پاٹودی سے نکل کر جھجر کا رخ اختیار کرتی ہیں۔ مصنفہ نے اس واقعے کی تمہید اس طرح بیان کی ہے:

"صرف تین تو رتھیں تھیں۔ اور دو سو عورتیں۔ الٰہی اب کیا کریں۔ کس کو چھوڑیں اور کس کو ساتھ لے چلیں۔ آخر ناچار، جتنی سواریاں رتھوں میں سمائیں وہ گچ مچ ہو کر سوار ہوئیں۔ باقی ماما، اصیلیں اور بیبیاں بھی پیادہ پا چلیں۔ بال بچوں کو گودیوں میں اٹھائے ہوئے۔ گٹھری پنجی بغل میں دبائے ہوئے۔ حیران سرگرداں، مرد کوئی ساتھ نہیں۔ بے سرا قافلہ ہے کہ جھجر کے رستے چلا جاتا ہے۔ اور پھر گھروں کو اکیلا چھوڑ آئے ہیں، نہ جن پر چوکی دار ہے نہ رکھوال۔ مگر اس وقت کیا گھر اور کس کا مال ٹال۔ اگر خیال تھا تو یہ تھا کہ آگے بڑھیے اور جلدی سے جھجر پہنچیے۔ لیکن پیادہ پا کی حالت عجب بے کسی اور بے بسی کی تھی۔ پاؤں پر چھالے، لبوں پر نالے۔ چشم گریاں، آنسو رواں۔ کسی کا پانچہ (پائنچہ) جھاڑ میں الجھا تو کسی کا دوپٹہ کھیت کی باڑ میں الجھا۔ کوئی چلتی تھی، کوئی تھکتی تھی، کوئی اٹھتی تھی، کوئی بیٹھتی تھی۔ بھلا کبھی کسی نے رستہ چلا ہو تو چلا جائے۔ اور جس حال میں کھٹکا یہ لگا ہوا کہ وہ باغی آئے۔ چوروں کا ڈر جدا۔ ہزار مشکل اور خرابی سے میل ڈیڑھ میل پاٹودی سے نکلے تھے۔ اندھیری رات، گھٹا سر پر تُلی کھڑی تھی کہ بجلی جو چمکی تو سامنے سے پانچ چھے سوار کھڑے نظر آئے ...."

اس قسم کے واقعہ نگاری کے علاوہ زندگی کے روزمرہ احوال و رسومات کا ذکر بھی مصنف نے خوب صورتی اور خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ رسومات میں سے ۰ مثلاً ان رسومات کا ذکر مختلف مقامات پر آیا ہے۔

بیوی کی صحنک
پیر دیدار کا کونڈا
چالوں کی رسم
چھنا چھنی کی چھٹی
شب برات کی آتش بازی
گلے کا گنڈا بڑھانا
محرم کی قفلیاں اور گوٹے

مصنف نے اپنی سرگزشت میں اپنی زندگی کے تقریباً تمام اہم واقعات کو کہیں تفصیل اور کہیں اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اور پھر اہم مقامات پر تاریخ و سنین کے اندراج کا اہتمام بھی کیا ہے۔ اس اہتمام کو اور اپنی سرگزشت کے ضمن میں ریاست کے قیام کے تاریخی و سیاسی پس منظر اور اپنے اجداد کے تاریخی و سوانحی حالات کو اس نے جو خاص اہمیت دی ہے ۰ اس سے تاریخ سے اس کے شغف کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر جزئیات کو بھی اس نے اس طرح تحریر کر دیا ہے کہ یہ سرگزشت اس کی زندگی اور اس کے نشیب و فراز کی ایک مکمل تصویر پیش کر دیتی ہے۔ مصنف نے اسے ابواب یا فصلوں میں تقسیم نہیں کیا۔ جگہ جگہ موضوع کے اعتبار سے بین السطور اس طرح عنوانات تحریر کیے ہیں کہ بیان کا ربط نہیں ٹوٹتا۔

جن حالات و واقعات کے نتیجے میں مصنف کی زندگی متاثر ہوئی یا اس میں نشیب و فراز پیدا ہوئے ۰ مصنف نے سب ہی کو بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ اور پھر واقعات کو جزئیات کے ساتھ جس طرح تحریر کیا ہے ۰ ان سے اس کی حقیقت نگاری اور راست گفتاری کا ثبوت ملتا ہے۔ تمہید میں خود مصنف نے لکھا ہے:

"اس کے لکھنے میں مجھے کئی باتوں کا لحاظ رہا ہے۔ اوّل تو یہ کہ بیان کو بہت طول نہیں دیا، مختصر کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ خلافِ واقعہ کوئی بات نہیں لکھی۔ بناوٹ کو ہرگز دخل نہیں دیا۔ عبارت آرائی کچھ نہیں کی اور مطلب کو روزمرہ کی بول چال میں آسان لفظوں میں ادا کیا ہے۔"

مصنفہ کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ جو حوادث، خصوصاً جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران پاٹودی اور جھجر میں جو جو واقعات رونما ہوئے اور نتیجتہً یہاں کے رؤسا کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا ــــ یہ سب اس سرگزشت کا حصہ ہیں۔ زندگی کے عام روزمرہ واقعات و حالات اور رسم و رواج کا ذکر بھی مصنفہ نے جگہ جگہ اور ضروری مقامات پر کیا ہے۔ چنانچہ یہ سرگزشت ذاتی احوال کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے سیاسی و تہذیبی حالات کی تصویر کشی کے لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہے۔

اپنی ان مجموعی خصوصیات کے اعتبار سے ..... "بیتی کہانی":

(۱) اردو زبان و ادب کی تاریخ میں "اولین نسوانی خود نوشت سوانح عمری" ہے، اور

(۲) مصنفہ نے اپنے اسلاف اور خاندان کے حوالے سے ریاست پاٹودی کی جو سینہ بہ سینہ قدیم اور چشم دید معاصر تاریخ بیان کی ہے، اس موضوع پر اسے فی الوقت واحد، اہم اور بنیادی مأخذ سمجھا جانا چاہیے۔

پیش نظر متن کی ترتیب اصل نسخے کے مطابق ہے۔ تمام عنوانات کا اہتمام خود مصنفہ نے کیا ہے۔ محض ابواب کی تقسیم اس راقم نے کی ہے۔ مقدمہ اور متن کے حواشی میں محوّلہ اسناد کی فہرست آخر میں شامل کر دی گئی ہے۔ وہ امور جن کی صراحت

متن سے ہوتی ہے یا جو تعلیقات میں بیان کرنے ضروری سمجھے گئے ، مقدمے میں تشنہ محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

عقیل
ٹوکیو ، یکم نومبر ۱۹۹۴ء

حواشی

(۱) مُرتبہ: ڈاکٹر عبدالسبحان، مطبوعہ: کلکتہ، ۱۹۸۶ء

(۲) "تاریخ عجیبہ المعروف بہ کالا پانی"، جو تصنیف کے چار سال بعد شائع ہوئی، مطبوعہ: لاہور، ۱۸۹۰ء

(۳) مطبوعہ: مشنری پریس، کلکتہ، ۱۸۲۰ء، بحوالہ گارسیں دتاسی

"HISTOIRE DE LA LITTERATURE HINDOUIE ET HINDOUSTANIE"

جلد دوم (پیرس، ۱۸۷۱ء) ص ۵۰۶، یہاں پیتمبر سنگھ کی ایک اور تصنیف "سیرالاسلام" کا ذکر بھی ہے، جو اس نے نور محمد، رام کرشن اور سیّد محمد کے اشتراک سے تالیف کی تھی۔ یہ اصلاً ہندو تھا، لیکن عیسائیت اختیار کرلی تھی

(۴) "مختصر حال منشی سیّد رجب علی خاں بہادر ارسطو جاہ" ۱۸۶۸ء، غیر مطبوعہ، مملوکہ ڈاکٹر گنڈا سنگھ (پٹیالہ)، بحوالہ گنڈا سنگھ

"A BIBLOGRAPHY OF THE PUNJAB" (پٹیالہ، ۱۹۶۶ء) ص۱۸۶۔

ونیز مشمولہ: نور احمد چشتی "تحقیقات چشتی" (لاہور، ۱۹۶۴ء) ص۱۵-۲۳۔

(۵) اس خود نوشت کا ایک نسخہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم (۱۹۲۶ء - ۱۹۸۳ء) کو ان کے انتقال سے کچھ قبل دستیاب ہوا تھا۔ وہ اسے اشاعت کے لیے ترتیب دینے کے خواہاں تھے، لیکن ان کی ناگہانی و حادثاتی رحلت (۲۵۔ نومبر ۱۹۸۳ء) کے باعث ان کی یہ خواہش قرطاس و قلم تک نہ پہنچ سکی۔ راقم نے مرحوم کے فرزند سعید حسن قادری سے اس نسخے کا عکس حاصل کرکے اسے ضروری تعلیقات کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ خود نوشت بہت طویل نہیں، قلمی نسخہ ۱۸X ۲۳ / ۸ کے محض ۸۹ صفحات پر مشتمل ہے، جس کے ہر صفحے پر کم و بیش ۱۸ سطریں ہیں۔

(۶) "THE IMPERIAL GAZETTEER OF INDIA" جلد ۲۰ (آکسفورڈ، ۱۹۰۸ء) ص ۲۷، ۱۸۶۳ء میں ۹۲۰۰۱ روپے مالگزاری ادا کی گئی تھی۔ ایل ایچ گریفن (L. H. GRIFFEN) "THE RAJAS OF PANJAB" (لندن، ۱۸۷۳ء) جلد دوم، ص ۳۷۳! ۱۸۷۷ء میں آمدنی ۹۲۷۴۴ روپے تھی۔ گوری شنکر "چھوٹا قلزم" (دہلی، ۱۸۷۹ء) ص ۶۴۔ ۱۸۸۸ء میں یہ آمدنی ۱۶۰۰۰۰ روپے ہوئی، چارلس میسی (CHARLES MASSY)
"CHIEFS AND FAMILIES OF NOTE." (الہ آباد، ۱۸۹۰ء) ص ۲۱۔

(۷) گوری شنکر، تصنیف مذکور، ص ۶۴۔

(۸) یہ کمشنری دہلی کے ماتحت، دہلی کے قریب راجپوتانے کی جانب ایک چھوٹی سی ریاست تھی، جو "ضلع رُہتک سے محروم ہو جانے کے بعد چھوٹی سی نہ رہ جاتی تو دارالحکومت سے بہت زیادہ قریب واقع ہونے کے باعث اسے برقرار رہنے کی کبھی اجازت نہ دی جاتی ـــــ اُس ریاست کی رسمی طور پر سلامی نہیں تھی۔ اس زمانے میں دارالحکومت کے اس قدر قریب بندوق، توپ یا بارود کا کسی بھی صورت میں استعمال یکسر خارج از بحث تھا" ـــــ نوابزادہ شیر علی خاں "پاکستان اور ہندوستان میں سیاست اور سپہ گری کی روداد" (لاہور، ۱۹۸۳ء) ص ۱۴۔ ۱۵۔
۱۹۱۱ء تک اس ریاست پر "نذرانہ" کی رسم واجب تھی، لیکن اس سال دہلی دربار کے موقع پر اسے ایسے سب تکلفات سے بے نیاز کر دیا گیا۔ جان میکلوڈ "THE PRINCELY HOUSE OF INDIA AND PAKISTAN" ص ۳۹۔

(۹) ان کے حالات: دارا شکوہ "سفینۃ الاولیاء" (کانپور، ۱۹۰۰ء) ص ۹۱۔۹۲ میں ہیں۔

(۱۰) ایضاً، ص ۱۹، و نیز عبدالرحمٰن جامی "نفحات الانس" (کلکتہ، ۱۸۵۸ء) ص ۳۴۷۔

(۱۱) "THE IMPERIAL GAZETTEER OF INDIA" جلد ۲۰، ص ۲۷ میں انھیں سہواً طلب فیض خاں لکھا ہے۔ "فیض طلب خاں مرحوم، جہاں دیدہ

اور زمانے کا گرم سرد چکھے ہوئے ہے۔ فوج اور ملک کے کام میں ہوشیار، مہمان نواز اور نہایت کفایت شعار ہے" عبدالقادر خاں رامپوری - وقائع عبدالقادر خانی - (علم و عمل) مرتبہ: محمد ایوب قادری جلد اول (کراچی، ۱۹۶۰ء) ص ۳۲۲۔

(۱۲) اصلاً PIERRE GULLIER، بحوالہ بک لینڈ، سی ای (BUCKLAND,C.E) "DICTIONARY OF INDIAN BIOGRAPHY" (لندن، ۱۹۰۶ء) ص ۳۳۳۔

(۱۳) سی یو ایچی سن (C. U. AITCHISON) نے انھیں سہواً بھائی لکھا ہے۔ "A COLLECTION OF TREATIES ENGAGEMENTS AND SANADS" (کلکتہ، ۱۸۹۲ء) حصۂ اوّل، ص ۴

(۱۴) چارلس میسی، تصنیف مذکور، ص ۲۲

(۱۵) ان کے علاوہ نارنول، بدلی، کنتی، بندول نامی گاؤں بھی انھیں اس شرط پر ملے کہ وہ چار سو گھوڑے انگریزوں کو دیں گے۔ "INDEX TO TITLES" مرتبہ: گورنمنٹ آرکائیوز آف انڈیا، دلی (دلی، ۱۹۶۹ء) ص ۵۹

(۱۶) متوفی ۲۲ جمادی الثانی ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۸۳۵ء، منشی غلام نبی "تاریخ جھجر" (مطبوعہ: فیض احمدی، ۱۸۶۶ء) ص ۲۲، و نیز "INDEX TO TITLES" ص ۵۹۔

(۱۷) نواب نجابت علی خاں کے عہد میں نواب فیض طلب خاں نائب اور مختار کل دخل اور خرچ نواب نجابت علی خاں کے تھے اور نواب نجابت علی خاں سے سوائے پرگنہ پاٹودی کے، دو پرگنے اپنے نام جاگیر لکھوا لیے تھے۔ بعد وفات نواب نجابت علی خاں کے، درمیان نواب فیض محمد خاں اور فیض طلب خاں کے قضایا ہوا۔ اور نواب فیض محمد خاں کے پرگنات اور جھجر اور بدلی نواب فیض طلب خاں سے چھین لیے۔ نواب فیض طلب خاں سرکار

میں نالشی ہوئے اور سند مہری نواب نجابت علی خاں کی پیش کی ۔ نواب فیض محمد خاں نے جواب دیا کہ میرے باپ کی مہر آپ کے پاس رہتی تھی ، اپنے ہاتھ سے مہر کر لی ہوگی ۔" "کیفیت ریاست جھجر" (قلمی) ، مخزونہ برٹش میوزیم ، (لندن) OR 1733 ، جلد ۸ ، ورق ۴۰۔۴۱

(۱۸) "اسدالدولہ ، ممتاز الملک بہادر ، ہزبر جنگ " خطاب ۔ " جوان ، قوی ہیکل اور وجیہ تھا اور ضروری علم فارسی اور عربی اس کو حاصل تھا اور نصف سے زیادہ کلام اللہ بھی اسے حفظ تھا ۔ انگریزی میں بھی مہارت رکھتا تھا " منشی غلام نبی " تاریخِ جھجر" ص ۲۵۰، " بہت قابل لوگوں میں سے تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی میں پوری مہارت رکھتے تھے۔" خواجہ حسن نظامی " دلی کی سزا" (دلی ، ۱۹۴۶ء) ص ۶۴،۴۰، ونیز بشیرالدین احمد " واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی" حصۂ سوم (دہلی ، ۱۹۹۰ء) ص ۲۶۴۔

(۱۹) منشی غلام نبی ، تصنیف مذکور ص ۲۳۴، ۲۳۵۔

(۲۰) انھیں ۲۳ دسمبر ۱۸۵۷ء کو لال قلعۂ دلی کے سامنے پھانسی دی گئی ۔ ان کے بارے میں ایسی شہادتیں بھی ملتی ہیں کہ انھوں نے جہاں انقلابیوں کا ساتھ دیا وہیں انگریزوں کے ساتھ بھی تعلقات استوار رکھنے چاہے۔ جان مٹکاف (JOHN METCALFE) (۱۸۲۸ء ۔ ۱۸۸۳ء) ، مجسٹریٹ دلی ، ان کا ذاتی دوست تھا اور بغاوت کے دنوں میں انھوں نے مٹکاف کی مدد بھی کی تھی۔ لیکن اس نے ان کی کوئی مدد نہ کی

"TWO NATIVE NARRATIVES OF THE MUTINY AT DELHI"

(ویسٹ منسٹر ، ۱۸۹۸ء) ص ۲۳۳ ، ان کے خسر نواب عبدالصمد خاں نے تین سو سپاہیوں کے ساتھ بدلی سرائے کے مقام پر انگریزی فوج سے مقابلہ کیا، لیکن ان کے بقیہ ،، سپاہیوں نے کرنال میں انگریزی فوج کی معاونت کی۔

(لاہور ، ۱۸۸۵ء) " ROHTAK DISTRICT GAZETTEER 1883-84 "
ص ۲۹۔ ۳۱ ، جھجّر اور جنگِ آزادی کے لیے : منشی غلام نبی " تصنیف مذکور ،
ص ۲۶۳۔ ۲۶۸ ، ونیز مہاراج کشن رائے بہادر " تاریخ ضلع رُہتک "
(لاہور ، ۱۸۸۴ء) ص ۷۲۔ ۹۲۔

(۲۱) نواب اکبر علی خاں کے اس دوران رویّے کے لیے : کمال الدین حسینی
" قیصر التواریخ " جلد دوم (لکھنؤ ، ۱۹۰۷ء) ص ۴۵۷ ، چارلس میسی ، تصنیف
مذکور ، ۲۳۔ ۲۴ ، " اکبر علی خاں نے نواب جھجّر اور دیگر ریاستوں کے
حکمرانوں کے ساتھ بہادر شاہ ظفر سے ملنے کی درخواست کی ، لیکن انکار کر دیا
گیا " عبداللطیف " ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ " مرتبہ : خلیق احمد نظامی (دلی
۱۹۵۸ء) ص ۷۵ ، ۱۳۹۔ ۱۴۰ ، ۱۷۸ ، جب کہ منشی جیون لال نے لکھا ہے کہ
انھوں نے ایک عرضی دے کر ملاقات سے معذوری ظاہر کی تھی ، لیکن
انھیں حکم ملا کہ جلد حاضر ہوں۔ ایضاً ، ص ۱۰۸ ونیز مٹکاف ، تصنیف مذکور ،
ص ۹۷ ، بغاوت کے دوران گوڑگاؤں کے ڈپٹی کمشنر فورڈ (FORD) کا محافظ
دستہ پاٹودی کا فراہم کردہ تھا۔ "GORGAON DISTT GAZETTEER 1910"
حصۂ اوّل (لاہور ، ۱۹۱۱ء) ص ۲۳ ، بغاوت کے دوران رئیس پاٹودی کو
بہادر شاہ ظفر کی جانب سے شُقّہ بھیجا گیا تھا (امداد و اعانت کے لیے) لیکن
انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مرزا حیرت دہلوی ، " چراغِ دلی " (دلی ،
۱۹۸۷ء) ص ۴۵۳ ، ونیز این اے چک (N.A.CHICK)
" ANNALS OF INDIAN REBELLION " (لندن ، ۱۸۶۰ء) ص ۱۵۵ نواب
عبدالرحمٰن خاں کا ایک خط بنام گریٹ ہیڈ (WILLIAM GREAT HED
۱۸۲۹ء۔ ۱۸۵۸ء) مورخہ ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء ، مشمولہ : سلیم قریشی " غداروں کے
خطوط " (دلی ، ۱۹۹۴ء) ص ۱۳۳۔ ۱۳۴ جنگِ آزادی کے دوران ان کے اور
نواب اکبر علی خاں کے رویّوں کو پیش کرتا ہے۔

(۲۲) " تذکرۂ رؤسائے پنجاب " مصنفہ: سر لیپل ایچ گریفن اور کرنل میسی، اردو ترجمہ: سید نوازش علی (لاہور، اشاعت ثانی، ۱۹۹۳ء) ص ۹۴، کے مطابق ان کی وفات ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔

(۲۳) ایضاً میں سنہ وفات ۱۸۷۳ء درج ہے۔

(۲۴) ولادت: ۱۸۶۳ء، ایضاً، یہاں ان کے فرزند کا نام محمد ابراہیم علی خاں (ولادت: ۱۸۸۷ء) بتایا گیا ہے۔

(۲۵) ایضاً میں ان کا نام وسعت علی خاں اور سنہ ولادت ۱۸۷۰ء تحریر ہے اور ان کے فرزندوں کے یہ نام درج ہیں: محمد فیاض علی خاں (ولادت: ۱۸۹۴ء) اور محمد حامد علی خاں۔

(۲۶) ایضاً کے مطابق ان کا انتقال ۱۹۰۳ء میں ہوا۔

(۲۷) ولادت: ۱۸۷۳ء ایضاً، یہاں ان کے فرزند کا نام محمد جمیل الرحمٰن خاں اور سنہ ولادت ۱۹۰۳ء تحریر ہے۔

(۲۸) ایضاً میں ان کی وفات کا سنہ ۱۹۰۱ء تحریر ہے۔ جب کہ ان کے فرزندوں کے نام یہ ہیں: محمد حسین خاں (ولادت: ۱۸۶۷ء)، محمد احمد حسین خاں (ولادت: ۱۸۶۸ء)، محمد شمشاد حسین خاں (ولادت: ۱۸۹۳ء)، محمد سعادت حسین خاں (ولادت: ۱۸۹۹ء)۔ ان میں سے محمد احمد حسین خاں کے فرزندوں کے یہ نام درج ہیں: محمد صابر علی خاں (ولادت: ۱۸۹۵ء)، محمد منور علی خاں (ولادت: ۱۸۹۸ء)، محمد انور علی خاں (ولادت: ۱۸۹۹ء)، محمد نواب خاں (ولادت: ۱۹۰۱ء)

(۲۹) " THE IMPERIAL GAZETTEER OF INDIA " جلد ۲۰، (لندن، ۱۹۰۸ء) ص ۲۷ میں ان کا سنہ پیدائش سہواً ۱۸۶۳ء تحریر ہے، لیکن نوابی کے اختیارات ملنے کا سنہ ۱۸۹۸ء بتایا گیا ہے۔ مصنف نے نواب محمد مختار حسین خاں کی اولاد میں ایک دختر اور محض ایک فرزند نواب محمد ممتاز حسین خاں

کا ذکر کیا ہے ۔ جب کہ اسی خانوادے کے ایک فرد نوابزادہ شیر علی خاں نے انھیں اپنا بڑا تایا قرار دیا ہے ۔ اور اپنے والد محمد ابراہیم علی خاں (۱۸۸۷ء ۔ ۱۹۱۸ء) کو ان کا چھوٹا بھائی بتایا ہے ۔ تصنیف مذکور ، ص ۲۵ ، لوہارو کے نواب شمس الدین احمد خاں (متوفی ۱۸۳۵ء) کے نواسے نواب قاسم علی خاں کی دختر سردار جہاں بیگم نواب ممتاز حسین خاں سے منسوب ہوئیں ۔ یہ سائل دہلوی (۱۸۶۳ء ۔ ۱۹۴۵ء) کی ماموں زاد بہن تھیں اور بے اولاد رہیں ۔ حفیظ الرحمان واصف " تذکرۂ سائل " (دہلی ، ۱۹۷۵ء) ص ۳۷ ، ۳۸ ، ۷۷ ، نواب ابراہیم علی خاں کی شادی شہر بانو بیگم دختر نواب سر امین الدین احمد خاں عرف فرخ مرزا (۱۸۶۰ء ۔ ۱۹۳۶ء) ولد نواب علاءالدین احمد خان لوہارو (متوفی ۱۸۸۴ء) سے ہوئی تھی ، ایضاً ص ۷۵ ، نواب افتخار علی خاں (۱۹۱۰ء ۔ ۱۹۵۲ء) فرزند نواب ابراہیم علی خاں ، سائل دہلوی کی بھانجی کے فرزند ہونے کی وجہ سے ان کے نواسے تھے ۔ ایضاً ص ۷۵ ، ۱۲۴ ، نوابین لوہارو کے لیے : متعدد ماخذ میں سے " تذکرہ روساے پنجاب " ص ۹۹ ، و بعدہ اور "DISTRICT GAZETTEER OF LOHARO STATE" ، (لاہور ، ۱۹۱۹ء) ص ۲ ۔ ۷ ۔

(۳۰) " تذکرۂ روساے پنجاب " ص ۹۸ ، ۱۸۹۸ء تا ۱۹۱۳ء ۔ جان میکلوڈ ، تصنیف مذکور ، ص ۳۹ ۔

(۳۱) دی ۔ پی ۔ مینن
" THE STORY OF THE INTEGRATION OF THE INDIAN STATES (بمبئی ، ۱۹۵۶ء) ص ۳۰۹ ۔ اس موقع پر نواب کے اخراجات کے لیے ۸۰۰۰۰ روپے مقرر ہوئے ، لیکن ۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو یہ بھی موقوف ہو گئے ۔ جان میکلوڈ ، تصنیف مذکور ، ص ۴۰ ونیز تفصیلات کے لیے ص ۳۹ ۔ ۴۱ ۔ " بیتی کہانی " سے قطع نظر ، عہد مابعد کا جو شجرہ ایضاً ص ۴۱ میں ملتا ہے وہ یوں ہے :

- محمد اکبر علی خاں
  - عنایت حسین خاں
    - حبیب الرحمٰن خاں
      - ولایت علی خاں
      - احمد حسن خاں
        - منور علی خاں
        - صابر علی خاں
      - محمد حسن خاں
  - صادق علی خاں
  - محمد جعفر علی خاں
    - محمد وصیت علی خاں
      - محمد فیاض علی خاں
    - محمد مظفر علی خاں
      - محمد ابراہیم علی خاں
  - محمد اصغر علی خاں
  - محمد تقی علی خاں
    - محمد مختار حسین علی خاں
      - محمد ممتاز حسین علی خاں
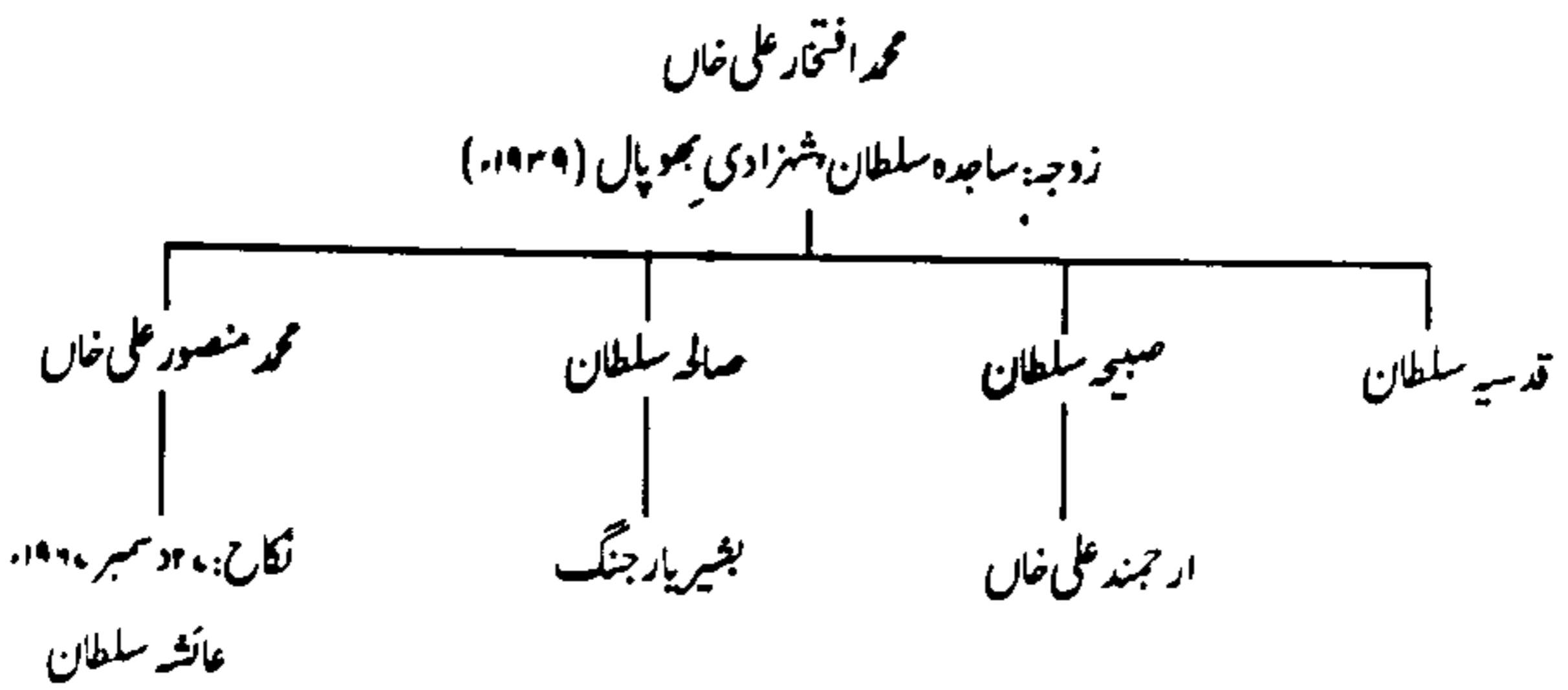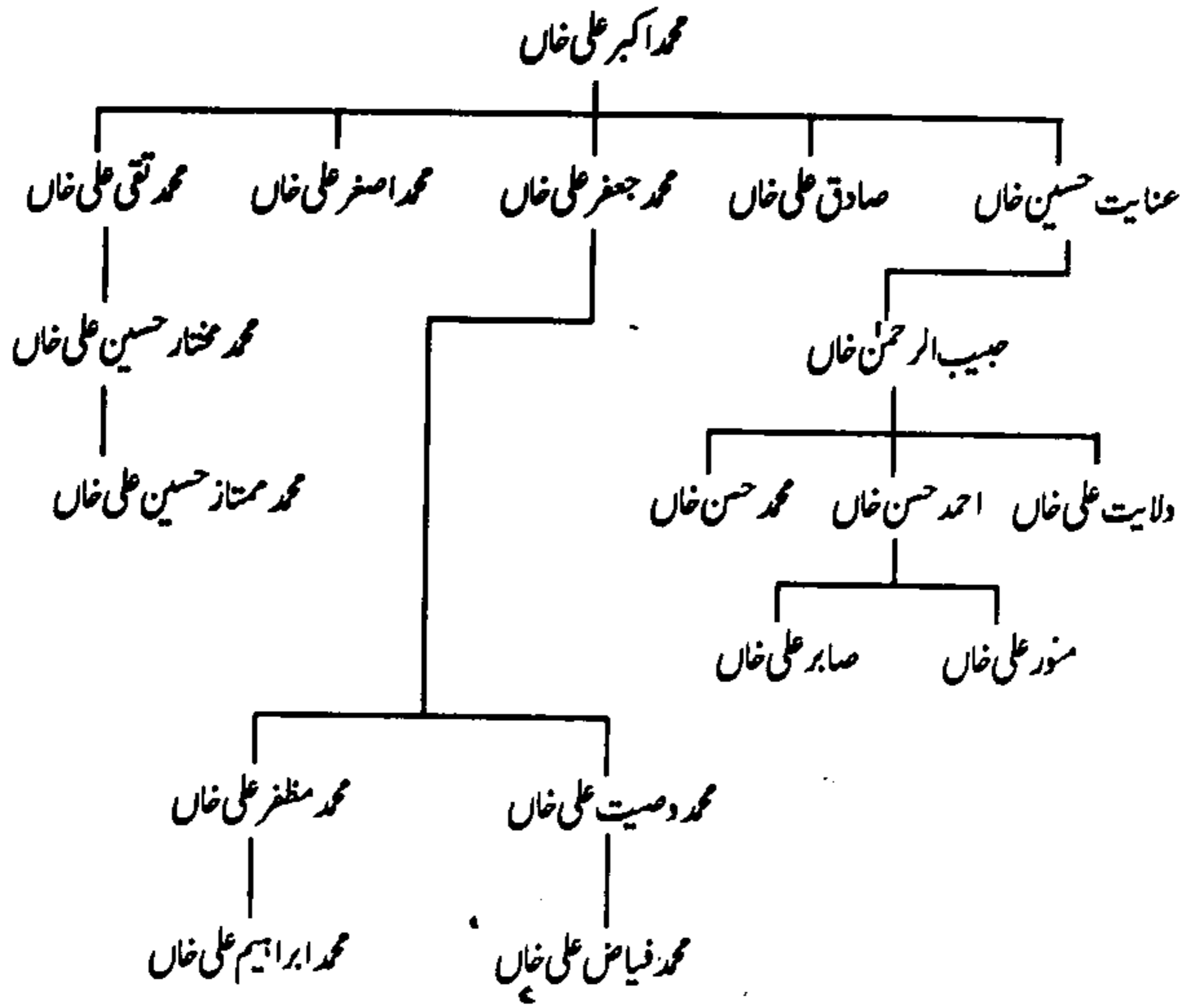
متن

بیتی کہانی

فہرستِ عنوانات

باب اوّل : بیتی کہانی کا آغاز

باب دوم: تاریخ مختصرِ خاندان پاٹودی

حال ریاست پاٹودی کا

باب سوم : بیتی کہانی کا اِتمام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

عمر بھر میں آدمی پر جو جو کچھ گزرتا ہے، اگر ساری بپتا کو غور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو حقیقت میں خدا کی قدرت کا ایک عجیب تماشا نظر آئے اور وہ تماشا انسان کی غفلت و بے پرواہی دور ہونے کے لیے ایک عمدہ نصیحت کا سبق ہو۔ وہ جہان کا پیدا کرنے والا اور سب کو روزی دینے والا، کل کا مالک، سارے بادشاہوں کا بادشاہ، آسمان اور زمین کا پیدا کنندہ خدا، جس کو چاہتا ہے مارتا ہے، جس کو چاہتا ہے جلاتا ہے۔ کبھی امیری دیتا ہے کبھی فقیری۔ کہیں عزّت بخشتا ہے، کہیں حقیری۔ گناہ گاروں کو گناہوں سے بچاتا ہے۔ گمراہوں کو راہ بر عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ ہماری ہدایت کے لیے اس نے اپنے پیارے رسول، سچے نبی، آخری زمانے کے پیغمبر، دو جہان کے سردار، کامل رہنما، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو بھیجا۔ جنھوں نے آ کر گمراہی کے اندھیرے میں ہدایت کا نور چمکا دیا اور عمر بھر کے بھٹکے ہوؤں کو نجات کا سیدھا رستہ بتا کر منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ خدائے رحیم کی حمد اور رسولِ کریم کی نعت کو پورا پورا ادا کرنے کا دعویٰ کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ یہ بات اپنی بساط سے بالکل باہر ہے۔ اس لیے اس بیان سے خاموش رہ کر اپنا ضروری مطلب ادا کرتی ہوں۔

اِس کتاب کے لکھنے کا سبب

اور وہ یہ ہے کہ اتفاق سے ۱۲ مئی ۱۸۸۵ء کو ایک مِس فلیچر صاحبہ (۱) نامی کی مجھ سے ملاقات ہوئی ۔ ان کی ملاقات کا مفصل حال تو میں نے اپنی " بیتی کہانی " کے آخر میں بیان کیا ہے ۔ لیکن یہاں اتنا لکھا جاتا ہے کہ جب میں نے مِس صاحبہ کو نہایت خوش اخلاق پایا تو پھر اُن سے ملنے کی آرزومند ہوئی اور انھوں نے جو مجھے اپنی ملاقات کا مشتاق دیکھا تو اکثر مجھ سے ملنے کو آتی رہیں ۔ پس اِس طرح سے آپس میں ربط بڑھ گیا اور باہمی محبت کا رشتہ مضبوط ہو گیا ۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ ایک دن کچھ اگلی پچھلی باتیں چیتیں ہوتی ہوتی مِس صاحبہ مجھ سے بولیں کہ اچھی بیگم میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی سوانح عمری لکھ کر مجھے دو کہ میں ان (اس) کو یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھوں گی ۔ میں نے مُعذر کیا کہ مجھ بدنصیب (کی) عُمری سرگزشت اس قابل نہیں ، جو لکھی جائے اور یادگار کے طور پر دی جائے ۔ ہرچند میں نے انکار کیا پر انھوں نے نہ مانا اور اصرار کر کے مجھے اپنی " بیتی کہانی " لکھنے پر مجبور کر دیا ۔ آخر کو ان کی خوشی کے لیے میں نے اپنے حالات کو ابتدا سے لکھنا شروع کیا اور لکھتے لکھتے چند روز میں تمام کر لیا ۔

اس کے لکھنے میں مجھے کئی باتوں کا لحاظ رہا ہے ۔ اوّل تو یہ کہ بیان کو بہت طول نہیں دیا ، مختصر کیا ہے ۔ دوسرے یہ کہ خلافِ واقعہ کوئی بات نہیں لکھی ۔ بناوٹ کو ہرگز دخل نہیں دیا ۔ عبارت آرائی کچھ نہیں کی ۔ اور مطلب کو روزمرہ کی بول چال میں ایسے آسان لفظوں سے ادا کیا ہے کہ مِس صاحبہ کی سمجھ میں اچھی طرح آ جائیں اور مضمون یا عبارت کے الجھاؤ سے وہ نہ گھبرائیں ۔ جب یہ سرگزشت ختم ہو گئی تو میں نے مس صاحبہ کے حوالے کی ۔ وہ مجھ سے لے کر بہت خوش ہوئیں ۔ اس

کے بعد مجھے خیال آیا کہ ایک شخص کی سرگزشت کے مطالعے سے اور لوگوں کو ایک قسم کی نصیحت کا اچھا موقع مل سکتا ہے اس لیے میں اگر اپنی سوانح عمری کو ایک کتاب کی حیثیت میں لاکر اپنی ہم جنس اور بہنوں کو بھی اس کے مطالعے کا موقع دوں تو عجب نہیں کہ اس کے پڑھنے سے ان کو بھی ایک قسم کا فائدہ حاصل ہو۔ اس لیے میں نے جنوری ۱۸۸۰ء میں اس کے اوّل میں یہ دیباچہ لکھ کر لگا دیا اور اس کو ایک چھوٹی سی کتاب بنا دیا۔ اور میں نے اس اپنی سرگزشت کو صرف کہانی ہی نہیں رکھا، بلکہ مناسب موقعوں پر اپنے جدّامجد نواب فیض طلب خاں صاحب مرحوم سے لے کر زمینِ حال تک کے تاریخی حالات بھی شامل کر دیے ہیں۔

اس نظر سے یہ کتاب میری کہانی کی کہانی ہے اور تاریخ کی تاریخ ہے۔ اب میں اس کی پڑھنے والیوں سے بہت التجا کے ساتھ اس امر کی درخواست کرتی ہوں کہ اگر میری حقیقت یا کہانی کی عبارت میں خطا یا لغزش پائیں تو مہربانی کی نظر سے معاف فرمائیں۔ اور مجھے طعن و تشنیع کا نشانہ نہ بنائیں، کیوں کہ انسان سہو (و) نسیان کا پتلا بنا ہوا ہے۔ اگر مجھ سے بھی خطا ہوئی ہو تو تعجب کیا ہے۔

بابِ اوّل

بیتی کہانی کا آغاز

بیتی کہانی کا آغاز

بُوا مس فلیچر میری کہانی پڑھ کر تم کیا نفع پاؤ گی۔ رنج و غم کھاؤ گی۔ اپنا جی دکھاؤ گی اور کچھ حظ نہ اٹھاؤ گی۔ اور اگر ضد ہی کرتی ہو تو ایلو میں اپنی سرگزشت ابتدا سے انتہا تک لکھے دیتی ہوں۔ ذرا خیال سے پڑھنا۔ گھبرا نہ جانا۔

تاریخِ پیدائش:

میں بدنصیب پانچویں ربیع الثانی ۱۲۶۳ھ (۲) کو پیدا ہوئی تھی۔ میرے پیدا ہونے کی میرے ابّا جان نواب محمد اکبر علی خاں (۳) صاحب مرحوم رئیس پاٹودی کو بڑی خوشی ہوئی تھی۔ چناں چہ اسی وقت توپ خانے میں حکم پہنچا کہ خوشی کی شلکیں سر ہوں۔ بس توپیں چھوٹنے لگیں اور چاروں طرف مُبارک سلامت کا غُل مچ گیا۔ دادی اماں نے میرے ابّا جان سے کہا کہ میاں تم نے تو لڑکی کے پیدا ہونے کی ایسی خوشی کی ہے جیسے کوئی بیٹا پیدا ہونے کی کرتا ہے۔ ابّا جان نے جواب دیا کہ اماں جان مجھے تو اس بیٹی کے پیدا ہونے کی ایسی خوشی ہوئی ہے کہ سات بیٹوں کے پیدا ہونے کی بھی اتنی خوشی نہ ہوتی۔ تو یوں یہ دھوم دھام ہو رہی تھی کہ:

رئیس جھجر کا آنا:

اتفاق سے اسی دن نواب عبدالرحمن خاں (۴) صاحب رئیس جھجر (۵) بھی پاٹودی میں آن موجود ہوئے۔ اندر محل میں آئے۔ مُبارک سلامت کا غوغا سن کر پوچھا کہ آج کاہے کی خوشی ہے؟ دادی اماں نے جواب دیا کہ میاں آج میرے [illegible]

پیدا ہوئی ہے ۔ یہ سنتے ہی نواب صاحب نے کہا کہ لاؤ لڑکی کو مجھے بھی دکھاؤ ۔ مجھ بدنصیب کو دیکھ کر جھٹ گود میں اٹھالیا ، پیار کیا اور میرے ابّا جان سے کہا کہ دادا جان یہ لڑکی تو میں نے لے لی ۔ یہ کہہ کر اُسی وقت مصری منگا میری گھٹی میں ڈال دی۔

قرار پانا نسبت کا :

اور فرمایا کہ اس کی نسبت میں نے اپنے فرزند محمد نور علی خاں کے ساتھ کی۔ نواب صاحب کا یہ کہنا تھا کہ اُسی وقت شادیانے بجنے لگے ۔ دھوم مچ گئی ۔ گھر گھر یہ خوش خبری پہنچ گئی ۔ ہر ایک محل سے بیگمیں آنی شروع ہو گئیں۔ سواریوں پر سواریاں اترنے لگیں ۔ خوشی کی محفلیں جم گئیں ۔ ناچ رنگ ہونے لگا ۔ ڈوم ، ڈھاڑی ، ماما ، اصیلوں کو انعام تقسیم ہونے لگے ۔ میری یہ حقیقت ہوئی کہ ایک نواب صاحب کے گھر تو پیدا ہوئی تھی ، دوسرے کی بہو ٹھہری ۔ اب تو انا ، ددا ، چھوچھو مانی ہاتھوں چھاؤنی اللہ بسم اللہ کرنے لگیں۔

بیگماتوں کا آپس میں اشارہ کنایہ کرنا :

اور محلوں سے بیگمیں جو آئیں ، آپس میں اشارہ کنایہ کرتی تھیں۔ کوئی کہتی تھی ، اچھی دیکھنا کیا نصیب دار لڑکی پیدا ہوئی ہے ۔ پیدا ہوتے ہی نواب صاحب کی بہو بن گئی ۔ کوئی بولی ، ہاں بوا ، آخر پیدا بھی تو نواب صاحب ہی کے گھر ہوئی ہے ۔ نصیب داری تو اس کی ظاہر ہے ۔ کسی نے کہا ، اچھی ، دیکھ تو سہی ، ہمارے نواب صاحب کی اللہ رکھے اور بھی تو اولاد ہے ۔ اس کے اور بھی تو بہن بھائی ہیں ، کوئی بھی ایسا نصیب دار پیدا ہوا؟ کوئی جواب دیتی ، بوا ، اپنا اپنا نصیب اپنے اپنے ساتھ ہے ۔ غرض کوئی حسد سے کھسیانی ہوتی تھی، کوئی خوش ہو کر ہنستی تھی ۔ پیدا ہونے کے ساتویں روز دستور کے موافق عقیقہ ہوا ۔ شہربانو بیگم میرا نام رکھا گیا۔ بڑے چلّے تک خوب گہما گہمی رہی ۔ بس دن عید رات شب برات تھی ۔ اسی موقع پر نواب صاحب

نے بڑے دھوم دھام سے چھٹی دی اور سو روپیہ ماہوار میری شیر خوری کا مقرر کر دیا۔

منگنی کی رسم :

اسی دن منگنی کی رسم بھی نہایت کرّوفر سے ادا ہوئی ۔ پھر تو ہر تہوار پر لین دین کی رسمیں ہونے لگیں ۔ آج کیا ہے ۔ عیدی چلی آتی ہے ۔ کل محرّم کی قفلیاں اور گوٹہ آیا ہے ۔ شب برات کی آتشبازی چلی آتی ہے ۔ اسی طرح طرفین سے ہزارہا روپیہ صرف ہو گیا ۔ شادی کے دن تک یہی بکھیڑے ہوتے رہے۔

حالاتِ شادی :

جب میں پانچ برس کی ہوئی تو نواب صاحب نے شادی کا پیغام میرے ابّا جان کو بھیجا ۔ دونوں طرف سے بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں ۔ بھلا بو' نواب صاحب کا تو کہنا کیا وہ تو بارہ محال کے مالک تھے۔ اُنھوں نے تو دو ڈھائی لاکھ روپیہ اس شادی میں لگا دیئے ۔ دو مہینے پہلے اپنے ہاں ناچ رنگ کی محفلیں جمادیں ۔ تمام شہر جھجھر اور اپنے سارے لشکر کی دعوت کی ۔ دلی اور اس کے گردونواح کے رئیسوں امیروں کو جمع کیا ۔ جب تین روز نکاح کے باقی رہے تو بڑے تجمّل سے برات لے کر پاٹودی آئے۔

برات کا پاٹودی آنا :

ایک پلٹن پیادہ اور پانچ سو سوار ، ایک توپ خانہ ، بگھیاں ، خاصے گھوڑے ، ہاتھی ، رتھیں ، تمام دلی اور اس کے آس پاس کے رئیس ، امیر ، سینکڑوں تماشائی ، نفیری والے نقارچی ، سو ڈیڑھ سو طائفے ، بیسوں دکاندار اس سارے بکھیڑے کو ساتھ لیے ہوئے پاٹودی سے دو میل کے فاصلے پر ، جہاں پڑاؤ ہے ، آن کر اترے ۔ اور پڑاؤ سے قلعے تک دو رویہ ٹمائر بندی کرائی ۔ سنا ہے کہ رات بھر اس میں چراغوں کی ایسی روشنی رہتی تھی کہ دن کے اجالے کو مات کرتے تھے ۔ ہرچند میرے ابّا جان ایک

چھوٹی سی ریاست کے مالک تھے مگر اس پر بھی لاکھ سوا لاکھ روپیہ میری شادی میں صرف کیے تھے ۔ تین روز تک اپنے تمام لشکر اور امیروں ، رئیسوں ، مہمانوں کی دعوت کی ۔ ہندوؤں کو پوری ، کچوری ، مٹھائی دی ، مسلمانوں کو پلاؤ ، زردہ ، متنجن وغیرہ ، انواع و اقسام کے کھانے کھلائے ۔ خیر یہاں تو یہ جلسے ہو رہے تھے ،

ساچق کا تماشا دیکھنے دلہن کا جانا :

اب میرا حال سنو ، کہ میں نگوڑی پانچ برس کی جان ، بھلا مجھ کو کیا خبر کہ نکاح کس کو کہتے ہیں اور شادی کیا چیز ہے ۔ بوا ، جس وقت ساچق آئی' باجوں کا شور اور توپوں کی کڑک سنی ، بے اختیار پلنگ پر سے کود پڑی ۔ اور جھٹ دادی اماں کے گلے میں جا کر بانہیں ڈالدیں کہ اچھی دادی اماں ، ہم بھی برات کا تماشا دیکھیں گے ۔ بس میرا یہ کہنا تھا کہ ساری عورتوں نے ایک قہقہہ مارا اور چاروں طرف سے آن کر مجھے گھیر لیا ۔ انا ، ددا ، مانی چھوچھو کہنے لگیں کہ دوئی بیوی ، ہم تیرے واری قربان جائیں' بھلا ایسا بھی کوئی کرتا ہے ۔ اب سمدھنیں اتریں گی تو وہ دیکھ کر کیا کہیں گی کہ خود دلہن ساچق کا تماشا دیکھ رہی ہے ۔ بڑے شرم کی بات ہے ۔ مگر بوا ، میں نے ایک نہ سنی ، لگی ایڑیاں رگڑنے اور ایسا رونا شروع کیا کہ سارا گھر سر پر اٹھا لیا ۔ سب کے ہوش اڑا دیے ۔ آخر دادی اماں نے کہا ، اللہ ری ضدّن بچی ، اتنی سی جان نے ناچ نچا دیا ارے لوگو ، میں اسے کیوں کر تماشا دکھانے کو اس وقت اوپر لے جاؤں ۔ اندھیرے اجالے وقت اپنی ماں کی اکلوتی بچی ۔ اے اس کی ماں کہاں ہیں ، انھیں تو بلاؤ ۔ لیکن میں نے تو بلک بلک کر ان کو ناچار کر دیا ۔ آخر وہ اپنے دوپٹے کا آنچل اڑا ، سیدھے کوٹھے پر لے چڑھیں ۔ آپ اوٹ میں کھڑے رہیں اور میرا آدھا چہرہ باہر کر دیا ۔ پھر تو میں نے بھی ساچق کا خوب تماشا دیکھا ۔ دادی اماں بیچاری بوڑھی تھیں ، تھوڑی دیر میں تھک گئیں ۔ جلدی سے مجھے لے کر نیچے اتریں ۔ سانس چڑھ گیا ، دم پیٹ میں نہ سمائے ، عجیب حال ہوا ۔ لوگ انھیں دیکھ کر لگے بسم اللہ بسم اللہ کرنے ۔ اتنے میں

میری اماں جان بھی سامنے سے آ گئیں ۔ دیکھ کر کہنے لگیں ۔ ٹکی پڑے لڑکی تیرے ڈھنگوں پر ۔ دیکھ تو دادی کا کیا حال ہو گیا ۔ وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ سمدھنیں چھم چھم اُترنے لگیں ۔ خیر ساچق کی رسم ادا ہوئی ۔ آدھے بجے رات کے ابّا جان نے مہندی بڑے کرّوفر کے ساتھ دی ۔ دوسرے روز بڑی دھوم دھام سے برات آئی۔

تاریخِ نکاح :

۲۴ جمادی الاول ۱۲۶۹ھ کو صبح کی نماز کے کے بعد میرا نکاح ہوا (۶) ایک لاکھ پچیس ہزار روپے کا مہر بندھا۔ قاضی کو ڈھائی سو روپیہ نقد اور ایک دوشالہ نکاح خوانی کا دیا ۔ دلی کے شُہدوں کو سو سو روپیہ اور ایک شال انعام ملا ۔ باقی گھر کے میتوں کو ہزاروں روپیہ تقسیم کیے ۔ دوپہر تک رخصت کا سامان ہوا ۔ میرے ابا جان نے قریب ساٹھ ستر ہزار روپیہ کے جہیز دیا تھا ۔ کیا نہ تھا ۔ سب ہی کچھ تھا ۔ ڈیڑھ سو دیگ بھونے کے کھانے کے ساتھ کیے۔

رخصت ہونا برات کا :

جس وقت میں رخصت ہوئی ہوں ۔ محل میں ایسا کہرام تھا ۔ روتے روتے لوگوں کی ہچکیاں بندھ بندھ جاتی تھیں ۔ اور خاص کر میری اماں کی بے قراری اور دادی اماں کی آہ و زاری سے تو کلیجے کے ٹکڑے اڑتے تھے اور محل سے لے کر تمام قلعے میں ایسا سناٹا تھا ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ خدا نہ کرے دور پار سے شیطان کے کان بہرے کوئی موت کر کے گیا ہے ۔ بس مجھے جا کر خیموں میں اُتارا ۔ شام کو چوتھی کی رسم ادا ہوئی۔

برات کا جھجر پہنچنا :

دوسرے روز پچھلے پہر میں پٹودی سے چل کر دس بجے دن کے جھجر کے

قریب پہنچی۔ شہر سے ہم دو میل کے فاصلے پر تھے کہ ہزاروں آدمی تماشائی سڑک کے گرد جمع ہو گئے ۔ نواب صاحب کی تمام فوج برات کی پیشوائی کو آئی ہوئی اور سڑک کے گرد جمع ہوئی کھڑی تھی ۔ جب ہم اس انبوہ کے قریب پہنچے تو نواب صاحب بگھی سے اتر کر ہاتھی پر سوار ہوئے اور میری سکھ پال پر سے اشرفیاں نچھاور کرنی شروع کیں ۔ قلعے کے دروازے تک اشرفیاں نچھاور کرتے چلے گئے ۔ کہتے ہیں کہ کئی سو اشرفیاں نواب صاحب نے اس روز میری سکھ پال پر سے نثار کیں ۔ قلعے کے دروازے پر پہنچی تو پلٹنوں کے باجے بجنے لگے اور سلامی کی شلکیں دھائیں دھائیں چلنے لگیں۔ بیت:

بلند ہوتا تھا طنبور سے وہ جھرّاٹا
کرے ہے دیر تلک سن کے جس کو جی سَن سَن
کڑکتے تاشے تھے نقارے بجتے تھے ڈوں ڈوں
کڑکتی توپ سلامی کے وقت تھی دَن دَن

جب قلعے کے اندر پہنچی تو مبارک سلامت کی صدائیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ غرض بڑی دھوم دھام اور تجمّل سے مجھے محل میں جاکر اتارا۔ پھر وہاں جو کچھ ریت رسم ہوتی ہے وہ ادا ہوئی ۔ اور اس روز سے پانسو روپیہ ماہوار میرے خرچ پاندان کے نام سے نواب صاحب نے مقرر کر دیے۔ دو روز وہاں رہی ، پھر اپنے میکے چلی آئی۔ اس کے بعد چالوں کی رسم ہوئی۔ جب چاروں چالے ہو چکے تو اس کے بعد یہ دستور ٹھہرا کہ جب کبھی میں سسرال جاتی تو والدہ میرے ساتھ جاتیں۔ یہ بے تکلفی اس سبب سے تھی کہ نواب صاحب سے میرے ابا جان کا رشتہ پہلے سے بھی تھا۔ اور آپس کا اتحاد بہت بڑھا ہوا تھا۔ بس میں دو تین روز رہتی پھر میکے چلی آتی۔ یہاں آتی تو اپنی ہمجولیوں سہیلیوں سے کھیلتی رہتی۔ دو تین گھنٹے استانی جی سے پڑھتی بھی تھی۔ جہاں سبق یاد ہوا جھٹ استانی جی کو سنا دیا اور چھٹی ملی۔ پھر کھیل شروع ہوا۔ کبھی کڑھائی چڑھتی ہے، کبھی کچھ اور ہنڈ کلیا پکتی ہے۔ کبھی گڑیوں کے بیاہ کی دھوم ہے ، کبھی چمنا چمنی کی چٹی

میں ہمسائے کی لڑکیوں کا ہجوم ہے۔ غرض رات دن عیش میں گزرتا تھا۔ غم پاس نہ پھٹکتا تھا۔ ہُوا ایک تو بچپن الیل عمر، دوسرے میں اپنی ماں کی اکلوتی، ماں باپ کی لاڈلی۔ تیسرے امیر کے گھر میں پیدا ہوئی۔ امیر ہی گھر بیاہی گئی۔ آٹھ برس کی عمر کھیل کود ہی میں بسر کی۔ پھر تو نہیں معلوم کس کم بخت کل جبنی کا ٹوکا لگ گیا اور ایسی کسی چڑیل کی بدنظر اثر کر گئی کہ سارے عیش اور کھیل کود کی کسر نکل گئی۔ نواں برس شروع ہوا کہ ایک آفت کا گولا ٹوٹ پڑا۔

حالاتِ غدر ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء

مجھے خوب یاد ہے کہ رمضان کا مہینہ سولھواں روزہ تھا اور ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء تھی۔ خوب چلچلاتی گرمی پڑ رہی تھی۔ پیاس کی شدت لوں کی تیزی سے دگنی چوگنی ہوتی تھی۔ مُنہ پر ہوائیاں اڑی ہوئی، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی۔ ایسی حالت میں خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ روزہ کھولا شربت پیا، ذرا دم لیا۔ ناتوانی سے جان سنسن گئی تھی۔ تکان کے مارے کچھ نیند سی آ رہی تھی۔ چاہا کہ دم کے دم ایک جھپکی لے لوں۔ آنکھیں آدھی بھی آدھی بند تھیں۔ دیکھتی کیا ہوں، ابّا جان کچھ اداس صورت بنائے گھر میں تشریف لائے مگر زبان سے کچھ نہیں فرماتے۔ میں جلدی سے تعظیم کے لیے کھڑی ہو گئی۔ بے وقت آنے کا سبب پوچھا۔ مجھ سے تو کچھ نہ فرمایا۔

دہلی کے فساد کی خبر:

سنا اماں جان سے کہا کہ بیوی دلّی سے سوار آیا ہے اور یہ خبر لایا ہے وہاں غدر ہو گیا۔ یہ سُن کر بدن میں سناٹا سا تو آ گیا۔ مگر بچپن ہی تو تھا [illegible] نہیں نہ کیا۔ ہم کیا جانیں غدر کیا ہوتا ہے۔ اس کا انجام کیا ہو گا۔ جب ابا جان تشریف لے گئے، ہم بھی سو رہے۔ صبح کی نماز کے وقت ابا جان پھر آئے۔ میں نے بھی آنکھیں ملتے ہوئے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا اور اماں جان سے کہنے لگے

کہ دِلّی سے ڈاک آئی ہے۔ وکیل نے لکھا ہے کہ کل دس بجے دن کے کچھ ترک سوار سرکار انگریزی سے بگڑ کر دلی میں گھس آئے۔ اور بہت سے انگریزوں، ان کے بے گناہ بچوں اور میموں کو بڑی بے رحمی سے قتل کر ڈالا۔ کوٹھیاں لوٹ لیں، بنگلے پھونک دیے۔ یہ سنتے ہی ہوش اڑ گئے اور اب سمجھ میں آیا کہ غدر اس کو کہتے ہیں۔ پھر تو صبح شام خبریں آنے لگیں کہ آج میگزین اڑا اور کل بنک لٹا۔ جب کوئی خبر وحشت ناک سُنتی اداس ہو جاتی۔ تھوڑی دیر میں پھر کھیل کود میں لگ جاتی۔ اِسی طرح تین مہینے گزرے۔

پاٹودی کی تباہی کا حال:

بقر عید کی چودھویں یا پندرھویں تاریخ تھی۔ نہیں معلوم موئے کہاں کے الفتی ان پر خدا کی مار، باغیوں کے ساٹھ ستّر سوار ہماری ریاست کے لوٹنے کی نیت سے پاٹودی میں آ دھمکے۔ اور آتے ہی میرے بڑے بھائی جان محمد تقی علی خاں (۷) مرحوم کو پکڑ لیا اور کہنے لگے کہ ہم تو پانچ ہزار روپیہ لیں گے، جب ان کو چھوڑیں گے۔ ان کی بہت مِنّت سماجت کی اور سمجھایا مگر ان کے سر پر تو شیطان سوار تھا۔ وہ کب سُنتے تھے۔ ان کو نہ چھوڑا۔ ادھر ہم نے جو سنا تو جان بیکل ہو گئی۔ اور ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی سُنا کہ بھائی جان کے رفیق باغیوں کے مارنے کو اور اپنی جان دینے کو موجود ہیں۔ صرف یہ تامل ہے کہ کسی تدبیر سے بھائی جان ان کے چنگل سے صحیح سالم نکل آئیں۔ اب تو محل میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ کوئی کہتی ہے "الٰہی میرا بیٹا خیر صلاح سے آ جائے تو بیوی کی صحنک کروں" (۸)۔ کوئی کہتی ہے "میرا میاں جیتا جاگتا پھرے تو پیر دیدار کا کونڈا کروں۔" ہم بھی بلبلا بلبلا کر اپنے پروردگار سے دعا مانگتے تھے کہ "الٰہی بھائی جان کو جان کی سلامتی کے ساتھ اپنے گھر میں آنا نصیب ہو۔" عجب طرح کا تلاطم پڑا ہوا تھا۔ کسی کے اوسان بحال نہ تھے۔ اس وقت دادی اماں نے ابّا جان سے کہا "میاں اس کی جان پر سے صدقہ کیے تھے پانچ ہزار روپیہ۔ تم ان کو روپیہ دو اور بچے کو چھڑا کر لاؤ۔ خدا نخواستہ بچے کی جان پر کچھ بن گئی تو کیسی کم بختی ہو گی۔"

آگئی ۔ جس کو بھاگنا ہو جلد بھاگو ، ہرگز نہ ٹھہرو ۔" غرض تھوڑی دیر میں سارا بیڑا خالی ہو گیا ۔ ابّا جان نے بہتیرا سمجھایا اور چاہا کہ یہ تھمیں ، مگر کون سنتا تھا ۔ گویا موت سامنے کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ آخر جب کوئی نہ رہا تو ابّا جان نے فیل خانے سے ہاتھی کسوا کر منگائے اور وہ بھی اپنے بیٹوں کو ساتھ لیے ہاتھیوں پر سوار جھجر کی طرف روانہ ہوئے (۱۰)۔

عورتوں کی تباہی کا حال :

اب محلوں میں صرف عورتیں ہی عورتیں رہ گئیں ۔ پہلے تو بھائی جان ہی کے دم کے لالے پڑے ہوئے تھے اور ان کے ہی سہم کے مارے خون خشک ہو گیا تھا ، جب ان کو خدا نے اِس آفت سے بچایا تو دوسری اَن ہونی بلا آئی ۔ بیت :

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی میرے اللہ نئی

قلعے کو دیکھا تو سنسان ، ایک ہو کا میدان ، اوسان جاتے رہے اور کہتے تھے خدایا اب کیا ہو گا۔ یہاں ٹھہرے بنتی نہیں اور نکلیں تو سواریاں کہاں سے لائیں ۔ سارے کارخانے خالی ہو گئے ۔ اِسی فکر میں آدھی رات الٹ گئی ۔ آخر میری اماں جان نے نرگس ماما سے کہا " اری تو رتھ خانے میں جا تو سہی ، صندل رتھ بان کو جا کر تلاش تو کر ، اگر وہ ہو تو جس طرح بنے اپنے رتھ جُڑوا لا ۔" نرگس دوڑی گئی ۔ دیکھی تو صندل گھبرایا ہوا پھر رہا ہے۔ اس نے صندل سے رتھ جُڑوا ، لا حاضر کیے ۔ اِدھر دادی اماں کے رتھ تیار ہو کر آ گئے ۔ تیسری ، موتی محل نے اپنی رتھ منگالی ۔ صرف تین تو رتھیں تھیں۔ اور دو سو عورتیں ۔ الٰہی اب کیا کریں ۔ کس کو چھوڑیں کس کو ساتھ لے چلیں ۔ آخر ناچار جتنی سواریاں رتھوں میں سمائیں وہ تو کچھ پچ ہو کر سوار ہوئیں ۔ باقی ماما ، اصیلیں اور بیبیاں بھی پیادہ پا چلیں ۔ بال بچوں کو گودیوں میں اٹھائے ہوئے ۔ گٹھری نُنگی بغل میں دبائے ہوئے ۔ حیران ، سرگرداں ، مرد کوئی ساتھ نہیں ۔ بے سرا قافلہ ہے کہ جھجر کے رستے چلا جاتا ہے ۔ اور پھر گھروں کو اکیلا چھوڑ آئے ہیں۔ نہ جن پر چونکی دار

جُدا بلبلا رہی تھی ۔ خیر پانی تو پیا مگر روٹی کہاں سے لائیں۔ آخر دادی اماں نے کچھ روپے فقیر کو دیے کہ سائیں ہمارے بچوں کے واسطے روٹی پکادو۔ اے اس موئے ٹکڑ گدا نے جَو کے آٹے کے دس پندرہ روٹ پکا کر ہمیں لا دیے۔ جوں ہی نوالہ منہ میں ڈالا گولی بنا حلق میں پھنسا ، کوئی رویا کوئی ہنسا ۔ غرض دو دو چار چار نوالے پانی کے گھونٹوں سے حلقوں میں اتارے۔ جب کھانا نگل چکے تو اب پان کی سوجھی ۔ بھلا وہاں تو پیپل کے پتوں کے سوا پان کا نشان بھی نہ تھا۔ ہاں بعض شوقین ایسی بھی تھیں کہ اُنھوں نے سب کچھ تو وہیں چھوڑا تھا مگر پاندان ضرور لاد کر لائی تھیں ۔ اُن سے کسی نے پان لیا ، کسی نے چھالیا ۔ جس کو جو کچھ ہاتھ آیا وہ لے کر کھالیا۔ یہاں تو یہ ہو رہا تھا،

عورتوں کا جھجرؔ پہنچنا :

کہ اتنے میں کسی نے آن کر کہا کہ لو صاحبو تم سب کے لیے جھجرؔ سے سواریاں آ گئیں ۔ اِس خبر سے ہم سب خوش ہو گئے ۔ ابّا جان صبح ہوتے ہی جھجرؔ پہنچ گئے تھے ۔ ان سے تمام حال ہمارا معلوم ہوا ، اور فوراً سواریاں روانہ کیں۔ پھر ہم سب اِن سواریوں میں بیٹھ کر قریب شام جھجرؔ پہنچ گئیں ۔ اور وہاں پہنچ کر اگرچہ سب طرح راحت پائی مگر خانہ ویرانوں کو خاطر خواہ تسلّی کب آئے ۔ دس بارہ روز وہاں رہے ۔ جب یہ معلوم ہوا کہ حقیقت میں باغیوں کی اور فوج پاٹودی میں نہیں آئی اور خبر ہوئی تھی کسی نے جھوٹ اڑائی تھی تو سب کی خاطر جمع ہوئی اور ابّا جان نے واپس جانے کا ارادہ کیا ۔ سب خوش ہوئے ۔ بیت :

ہر ایک دیتا تھا آن آن کر مبارک باد
خدا نے خانۂ ویراں کو پھر کیا آباد

پاٹودی کی آبادی کا حال :

ابا جان جھجرؔ سے روانہ ہو کر پاٹودی پہنچے (۱۱) ہم اور ان کے سب متعلقین

بھی ایک دوسرے کے بعد آگئے۔ دیکھا تو عجب طرح کا سناٹا ہے ۔ اب یہ دور اوجڑ بستی سونے دیس کی مثل صادق آتی ہے ۔ گھر ہے کہ بھائیں بھائیں کر رہا ہے ۔ نہ کوٹھریوں میں اسباب ہے نہ دالانوں میں فرش ۔ چیز بست کیا نام ، جھاڑو دینے کو تنکا تک نظر نہیں آیا ۔ چینی کے برتن ٹوٹے ہوئے پڑے ہیں ۔ شیشہ آلات چکنا چور ہوئے دھرے ہیں ۔ نہ پلنگ ہے نہ چارپائی ، نہ دری ہے نہ چٹائی۔ مال اسباب نقد و جنس جو جو کچھ تھا ، سارے گھروں سے موئے گنوار ان پر خدا کی مار ، لوٹ کر لے گئے۔ آخر ان کی جانوں پر صبر کرکے نئے سرے سے پھر سامان درست کرنا شروع کیا ۔ گو ہزاروں کا نقصان ہوا لیکن جس قدر اس کا رنج تھا اس سے زیادہ اپنے لٹے گھروں میں آ جانے کی خوشی ہوئی۔ اس ہماری مصیبت کو دو ڈھائی مہینے گزرے تھے ۔

دہلی کی فتح کی خبر :

جو سنا کہ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو فوج سرکار انگریزی نے دہلی فتح کر لی اور دہلی پر قبضہ کر لے ، اکتوبر ۱۸۵۷ء کو فوج سرکاری مقام پاٹودی آئی ۔ چونکہ والدِ مرحوم نے باغیوں کی مفسدہ پردازی کے دنوں میں سرکار انگریز کی خیرخواہی کی تھی (۱۲) یعنی فورٹ صاحب بہادر (۱۳) ڈپٹی کمشنر گوڑگانوں نے ایک انگریز اور اس کی میم کو جو محفوظ رکھنے کے لیے بھیجا تھا ، اُن کو بحفاظت تمام رکھ کر پہاڑی پر انگریزی کیمپ میں بھجوا دیا تھا۔ اس کے علاوہ اُن مفسدوں کو تہ تیغ کیا تھا جو باغی فوج کی حیثیت سے پاٹودی پر چڑھ آئی تھی ۔ اس نظر سے سرکار دولت مدار نے میرے والد کی جاگیر بحال و برقرار رکھی ۔ اور وہاں سے فوج دوسرے روز ریواڑی (۱۴) گئی ۔ اس مقام کے قبضے کے بعد دادری (۱۵) پہنچی اور وہاں سے ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو چھوچھک و [illegible] نواب عبدالرحمٰن خاں رئیس جھجر کو گرفتار کیا (۱۶)

رئیس جھجر کی گرفتاری :

کوئی آدھے بجے ہوں گے ، یعنی وہ وہی رات ۱۸ ماہ صفر کی تھی ۔ نواب

عبدالرحمٰن خاں کی گرفتاری اور ریاست جھجرؔ کی بربادی کی وحشت ناک خبر سنی ۔ ایسا صدمہ اور قلق ہوا کہ بیان کے قابل نہیں ۔ پھر یہ فکر ہوا کہ دیکھیے انجام اس کا کیا ہوتا ہے ۔ افسوس اس کا انجام یہ ہوا کہ نواب جھجرؔ کو تو پھانسی ہوئی اور ریاست ضبط کی گئی ، نوکر چاکر تباہ اور برباد ہوئے اور ان کے رشتے دار اور اہل و عیال جلا وطن کیے گئے ۔ مردوں کو لودھیانہ جانے کا حکم ہوا ۔ اور عورتوں کو یہ اجازت ملی کہ چاہیں لودھیانہ رہیں یا جھجرؔ کے سوا جہاں مرضی ہو وہاں ۔ خیر ان سب میں میرے شوہر کو بھی لودھیانہ جانے کا حکم ملا۔

میری ساس کا خط ابّا جان کے نام آنا :

اس پر نور محل بیگم ، جو میری ساس تھیں ، انھوں نے اس مضمون کا ایک خط میرے ابّا جان کے نام لکھا کہ ہم کو لودھیانہ جانے اور وہاں کے رہنے کا حکم ہوا ہے اس لیے آپ کو لکھتی ہوں کہ آپ میری بہو شہر بانو بیگم کو بھی میرے ساتھ کر دیں کہ میں انھیں اپنے ہمراہ لودھیانہ لے جاؤں گی۔ کوئی پہر دن باقی ہو گا ، دیکھتی کیا ہوں کہ ابّا جان اداس چہرہ بنائے ہاتھ میں خط لیے چلے آتے ہیں مجھے دیکھتے ہی بے اختیار رونے لگے ۔ انھیں روتا دیکھ کر میں بھی رونے لگی ۔ اماں جان نے جو رونے کی آواز سنی وہ بے تحاشہ دوڑیں اور آن کر کہنے لگیں " اے ہے خدا کے لیے کہو تو سہی کیا ہوا۔" اس وقت ابّا جان نے وہ خط پڑھ کر سنایا ۔ بس کیا (کہوں) خط کا سُننا تھا کہ سب کے عقل کے طوطے اڑ گئے ۔ کہ ہے ہے یہ کیا ہوا ۔ اور مجھے تو یہ سنّاٹا تھا کہ ہائے اب وطن چھوٹے گا ۔ ماں باپ سے جدا ہوں گی (پرائے) شہر جانا پڑے گا ۔ اور سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ کہتے تھے کہ " جھجرؔ والے کا خاندان مجرم ٹھہرا ۔ وہ سب کے سب لودھیانہ جا کر قید کیے جائیں گے ۔ اور پھر وہاں سے آنے نہ پائیں گے ۔" میں ہر ایک کی سُنتی تھی اور ایک ایک کا مُنہ تکتی تھی ۔ اور کہتی تھی الٰہی یہ آفتِ آسمانی جو نازل ہوئی تھی میرے ہی سر پڑی ۔ یہ غدر جو ہوا تھا میری ہی

بربادی کے لیے ہوا تھا۔ بس زار و زار روتی تھی اور رو رو کر اپنی جان کھوتی تھی۔ میرا یہ حال دیکھ کر سہیلیاں بولیں کہ "بیگم کیوں اپنا جی کھوتی ہو، جو اس طرح بلک بلک کر روتی ہو۔ وہ دن خدا دکھائے گا کہ تم کو پھر ساتھ خیر کے یہاں لائے گا۔" بھلا ایسے دلاسوں سے مجھے چین کہاں۔ جان زار و نزار تھی اور دل بے قرار تھا۔ کھانا کیسا اور نیند کیسی۔ جب ابا جان نے میرا یہ حال دیکھا تو گھبرا گئے اور کہنے لگے میں تو لڑکی کو نہیں بھیجتا۔ ارادہ موقوف کرو۔ لیکن اماں جان نے نہ مانا اور میرا بھیجنا ہی مناسب جانا۔ سفر کی تیاری کی۔

لودہیانہ کے سفر کے حالات

اول جھجرّ کا جانا:

جب میں جھجرّ روانہ ہوئی ہوں تو مجھے یاد ہے کہ شعبان کا آخری دہا تھا۔ اس روز کی حقیقت کیا کہوں۔ پاٹودی میں اس دن ایسی اداسی چھائی ہوئی تھی کہ اپنا پرایا جو تھا غمگین تھا اور میرے والدین کا تو یہ حال تھا کہ جیسے بن پانی کی مچھلی تڑپتی ہے۔ ہائے میری اماں جان کی بے قراری و آہ و زاری سے تو کلیجے کے ٹکڑے اڑتے تھے۔ آخر دادی اماں نے اماں جان کو سمجھایا، کہا کہ "بیوی خدا سے خیر مانگو۔ دعا دینے کا وقت ہے۔ اللہ اس کو اس کے سسرال میں آباد و شاد رکھے اور پھر صحیح سلامت یہاں لائے۔ خدا کرے یہ ست پوتی ہو اور بوا بیٹیوں کا تو یہی معاملہ ہے۔ کیسی کیسی مصیبتوں سے پالا، پرورش کیا، پر یہ دھن پرائے کا، پرایا کیا کریں، کچھ بن نہیں آتی۔ ورنہ شہر بانو بیگم کو کبھی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ بس اٹھو اور اس کے سفر کرنے کی تیاری کرو۔" غرض سمجھا بجھا کر ان کو اٹھایا۔

ادھر میرا یہ حال تھا کہ کبھی حیرت میں نقشِ دیوار ہو جاتی تھی کبھی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگاتی تھی۔ اتنے میں ماتی نے آن کر کہا کہ بیگم سواریاں

تیار ہو کر آ گئیں پالکی دیوہڑی (دیوڑھی) پر لگی ہے ۔ رتھیں قلعہ کے گھوگس میں کھڑی ہیں۔ سُنتے ہی کلیجہ دھک ہو گیا ۔ اسی وقت ابّا جان آئے ۔ مجھ سے مل کر بہت روئے اور دلاسا دے کر کہنے لگے ۔" اچھا بیٹا سدھارو ۔ میں تم کو اللہ کی امان میں رخصت کرتا ہوں۔ اور خدا چاہے تو جلدی بلالوں گا ۔ تم گھبرانا نہیں اور جی نہ کُڑھانا ۔" اماں جان نے مجھے کولے میں بھر کر گود میں اٹھا لیا اور سب نے گلے لگایا ۔ اور کہا کہ " لو بیوی ۔ بسم اللہ کرکے سوار ہو ۔ تمھارا اللہ بیلی ۔ اللہ نگہبان ۔ امام ضامن کی ضامنی ۔ جس طرح تم ہمیں پیٹھ دکھاتی ہو۔ اسی طرح خدا تمھارا مُنہ دکھائے ۔ غم دوری دلوں سے دور ہو جائے۔" خیر جبراً قہراً سوار ہوئی ۔ سوار ہوتے ہوتے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی تھی اور کہتی تھی ۔ بیت:

چلے جائیں گے اُس جا کام ناکام
جہاں کا آ سکے نامہ نہ پیغام

ہائے ماں باپ سے یہ آخری ملنا تھا ؟ اب قیدِ فرنگ میں جاتی ہوں ۔ کیوں کر رہائی پاؤں گی ۔ جو پھر ان سے ملنے کو آؤں گی ۔ قہرِ درویش برجانِ درویش ۔ ہم پاٹودی سے روانہ ہو کر قریب شام جھجّر پہنچے ۔ میری والدہ میرے ساتھ تھیں اور ایک استانی جی ۔ ایک ددا اور ایک مانی ۔ دو کنیز ۔ دو مامائیں ۔ گو میری اتنی رفیق میرے ساتھ تھیں لیکن دل میں وہی کھٹکا لگا ہوا تھا کہ دیکھیے پھر بھی آنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں ۔ اگرچہ میرے ابّا جان نے میری آمدورفت کے باب میں انگریزی حاکموں سے بخوبی پختگی کر لی تھی ۔ مگر اس پر بھی میری مایوسی بدستور تھی۔

جھجّر سے لودہیانے کو جانا :

آخر رمضان کی ساتویں یا آٹھویں تاریخ ۱۲۷۴ ہجری (۱۱) میں لودہیانے کو ہم سب کا کوچ ہوا ۔ اما جان تو پاٹودی واپس چلی آئیں اور میں اپنی سُسرال والوں سمیت لودہیانہ لو روانہ ہوئی ۔ روز کا سفر ۔ ماں باپ کی جدائی کا غم ۔ طبیعت نہایت

اداس رہتی تھی ۔ لیکن یہ غنیمت تھا کہ میری دو بہنیں بڑی بیگم اور کلثوم بیگم بھی میری شریکِ سفر تھیں ۔ اس لیے کہ میری سسرال کے خاندان میں ان دونوں کی بھی شادیاں ہوئی تھیں ۔ بس ہوا رات بھر چلتے ۔ صبح کو منزل پر اترے ۔ گرمی کے دن تھے اور ریل ان دنوں میں تھی نہیں ۔ ہزار بارہ سو آدمیوں کا قافلہ تھا ۔ کچھ عورتیں تو پانی پت میں ہی رہ گئیں ۔ کیوں کہ ان کو وہیں رہنے کی اجازت ملی تھی ۔ باقی قافلہ سیدھا لودھیانے کو چلا گیا۔

قافلے کا لودھیانہ پہنچنا :

خدا خدا کرکے بیس دن کے عرصے میں لودھیانہ پہنچے شاید رمضان شریف کی ۲۸ تاریخ تھی ۔ کیونکہ ہم نے عید کا چاند لودھیانہ میں جاکر دیکھا تھا ۔ وہاں کے صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر نے ہم سب کے لیے پہلے سے مکان کا انتظام کر رکھا تھا ۔ پرانی سرائے جو وہاں مشہور ہے ۔ وہ ساری کی ساری خالی کرا رکھی تھی ۔ اس میں جا کر اترے مگر قافلہ بڑا تھا ۔ گنجائش نہ ہوئی ۔ اس واسطے لوگوں نے کرائے کے مکانات لے کر سکونت اختیار کی ۔ مگر میری ساس اور ان کے سب متعلقین سرائے میں رہے ۔ میرا یہ حال کہ دل اُچاٹ رہتا ۔ کیونکہ نیا شہر ۔ نئے لوگ ۔ سسرال میں بھی اتنا رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا ۔ اول اول نہ کسی سے شناسائی نہ ملاپ ۔ عجب طرح کی کشمکش میں مبتلا تھی۔

ساس کی ناحق کی خفگی :

اس پر طرہ یہ ہوا کہ خوش دامن صاحبہ کی ناحق کی خفگی مجھ پر ہونی شروع ہوئی ۔ وہ خوش دامنی کا نازیبا داب بٹھانے لگیں ۔ صبح کو سلام کرنے کے لیے حیران کھڑی ہوں ۔ آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتیں ۔ چپ ششدر ہوں کہ الٰہی کیا کروں ۔ کوئی خطا ہو تو معاف کراؤں ۔ میرے میکے سے خط آیا ہے اور کسی انیز یا ماما نے جا کر کہا کہ بیوی پاٹودی سے خط آیا ہے تو اس کو جواب یہ ملتی کہ تیرے ہم کیا کروں ۔ کبھی

خدا کی بندی نے یہ نہ پوچھا کہ خیر صلاح تو ہے یا اگر کوئی بیمار ہے تو وہ کیسا ہے میں اپنی ہمجولیوں میں بیٹھی ہوئی اگر کسی بات پر ہنس پڑی تو کہتیں ، " تمھیں کیا دکھائی دیا جو ہنستی ہو "؟ اور جو مجھے کبھی اپنے ماں باپ یاد آئے اور میں رونے لگی تو پوچھتیں " کیا تمھارا کوئی مر گیا ہے یا سناؤنی آئی ہے جو روتی ہو "۔ ناک میں دم آگیا میرے ساتھ کے جو آدمی تھے وہ بھی زچ ہو گئے ۔ ایک دن استانی جی نے انور محل صاحبہ ، سے جو میری سوتیلی ساس تھیں ، جا کر کل حقیقت بیان کی۔

سوکن کا سوکن کو سمجھانا :

انھوں نے آ کر میری ساس کو بہت سی ملامت کر کے اور پس و پیش سمجھا کر کہا کہ " دیکھو بہو کے ساتھ ایسا برتاوا برتو جیسے دنیا جہان کا دستور ہے ۔ وہ بات نہ کرو جس میں لوگ تمھیں نکو بنا دیں ۔ بہو کو شفقت اور دلاسے سے رکھو ، کیوں کہ وہ ابھی نادان ہے ، نگوڑی نو برس کی جان ہے ۔ پہلے ہی پہل اپنے ماں باپ سے جدا ہوئی ہے انھوں نے صرف تمھارے ہی بھروسے پر سینکڑوں کوس بھیج دیا ہے ۔ کیا اس کے بدلے تمھیں یہی چاہیے کہ تم اس کے خون کی پیاسی ہو جاؤ ۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گی۔ آخر پچھتاؤ گی ۔ اور دیکھو اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ بہو تمھاری برابری میں جواب دینا سیکھ جائے تو کیا بات رہ جائے گی ۔ علاوہ اس کے وہ کوئی غریب فقیر زادی تو نہیں ہے ۔ امیر کی لڑکی ہے ، اگر اس کے ماں باپ کو خبر ہو گئی تو کیسی تھڑی تھڑی ہو گی ۔ بوا خدا کو مانو ، ایسی باتوں سے باز آؤ ۔ بہو کی دلداری کرو ۔ گلے سے لگاؤ "۔ ہزار طرح سے سمجھایا ، مگر بھلا وہ کب مانتی تھیں۔

میری ددا اور ساس کی تکرار :

آخر ایک دن میری ددا اور ساس میں خوب چخ ہوئی۔ ددا بھی بھری تو بیٹھی تھی ، ایسے ہتھے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑیں کہ انھیں پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا ۔ پر بوا مجھے تو ہمیشہ بک بک جھک جھک کرنے سے پڑ رہی ہے ، جلتی بیٹھتی مگر دم نہ مارتی ۔ چپ

لٹ لی تھی۔ اور ایسا حال ہو گیا تھا کہ اچھی طرح نہ کھاتی تھی نہ پیتی تھی۔ رنگت زرد
آنکھوں میں حلقے، چہرہ اداس، صورت غمگین۔

استانی جی کا سمجھانا :

ایک روز استانی جی نے مجھے دیکھ کر کہا کہ " بیگم ایسی چپ چپ کیوں رہتی
ہو، بہو، ساس، نندوں کا تو ایسا ہی معاملہ ہے۔ ابھی سلامتی سے تمھارے میاں نادان
ہیں۔ جس وقت ماشاءاللہ ہوشیار ہو جائیں گے، اپنے نیک و بد کو آپ سمجھنے اور اپنی
بگڑی باتوں کا آپ بندوبست کرنے لگیں گے تو یہ سارے جھگڑے نبٹتے جاتے رہیں
گے۔" میں نے جواب دیا کہ " بے بے استانی جی، اتنی مدت تک یہ ظلم مجھ پر ہوتے
رہیں گے اور میں اس ہر دم کی کوفت سے جب تک کیوں کر زندہ بچوں گی۔ استانی جی
میں نے تو ایسی ساس نہ کسی کی سنی نہ دیکھی۔ میں تو ایسی زچ ہوئی ہوں کہ اپنی زندگی
سے بھی بیزار ہوں۔ جو بات ہے سو ٹیڑھی، جو ادا ہے سو نرالی۔" اس پر دوا نے کہا
کہ " استانی جی، خدا خدا کرو، نوج ایسی ساس کسی کی ہو۔ دیکھتی ہو کہ بات بات پر
لڑکی سے الجھتی ہیں۔ انھوں نے سمجھا کیا ہے۔ اب وہ ایک کہیں گی تو دس سنیں گی۔
کیوں کہ صبر کی حد ہو چکی۔ اب ہم سے نہیں رہا جاتا۔ تم کو یاد ہے، جس دن میرے
منہ لگی تھیں تو میں نے کیسے کیسے جواب دیے تھے۔ چپ ہی تو ہو رہیں۔" بوا، چھے
مہینے میں وہاں رہی، اسی فضیحتا فضیحتی میں کٹی۔

ابا جان کا خط میری ساس کے نام آنا اور میرا پاٹودی جانا :

چھے مہینے کے بعد ابا جان نے ایک خط میرے بلاوے کا میری ساس کے
نام لکھ کر صوبیدار اسمٰعیل خاں کے ہاتھ بھیجا۔ اور دس سوار چار پہرے سپاہیوں کے ان
کے ساتھ کیے۔ جس دن اسمٰعیل خاں مع اپنے ہمراہیوں کے لوہیٹہ میں پہنچے ہیں اور
انھوں نے وہ خط میری ساس کو دیا ہے اور اس کا مضمون مجھے معلوم ہوا ہے، اس روز
کی خوشی کا کیا بیان کروں۔ مارے خوشی کے خود بخود تھیں کہ باچھیں کھلی جاتی تھیں۔

اور یہ جی چاہتا تھا کہ اگر پر ہو جائیں تو اسی وقت اڑ کر چلی جاؤں۔ سہیلیاں آن آن کر چپکے چپکے مبارکباد دیتی تھیں۔ اور میں باغ باغ ہوتی تھی۔ چار پانچ روز اسمٰعیل خاں لودہیانہ میں رہے۔ میں نے وہ دن گن گن کر کاٹے۔

لودہیانہ سے پاٹودی کو آنا :

چھٹے روز لودہیانہ سے روانہ ہوئی۔ منزل بمنزل چلتے تھے۔ چودہ پندرہ روز میں دلی آئے۔ یہاں پہنچ کر ایک سوار کو پاٹودی روانہ کیا۔ اس نے جا کر وہاں میرے آنے کی خبر پہنچائی۔ سن کر ماں باپ کی جان میں جان آئی۔ دوسرے روز دلی سے روانہ ہوئی۔ اور گوڑ گاؤں میں پہنچ کر قیام کیا۔ شب وہاں گزار کر پاٹودی کا رخ کیا۔

بڑے بھائی صاحب کا پیشوائی کو آنا :

آدھی منزل طے کی ہو گی۔ سنتی کیا ہوں کہ بڑے بھائی جان محمد تقی علی خاں صاحب مرحوم میرے لینے کے واسطے چلے آتے ہیں۔ قریب آئے تو سواریاں دیکھتے ہی گھوڑے پر سے کود پڑے۔ آن کر مجھ سے ملے۔ رتھ میں سے اتار کر پالکی میں سوار کیا۔ نو بجے کے قریب پاٹودی میں پہنچے۔ محل میں اترے۔ اماں جان نے بلائیں لیں۔ گلے سے لگایا، پیار کیا۔ ابا جان مل کر بہت خوش ہوئے۔ دور نزدیک سے مبارکباد کی صدا پیدا ہوئی۔ مہمان آنے لگے۔ ڈومنیاں مبارکباد گانے لگیں۔ پیر دیدار کا کونڈا ہوا۔ بیوی کی نیاز دلائی۔ رات بھر رت جگا رہا۔ میں نے سسرال کا سارا قر[illegible] سنایا، کبھی ہنسایا کبھی رلایا۔ پھر تو بوا ہم سوا برس میکے میں رہے۔ نہایت خوش و خرم نہ کسی کا فکر نہ غم۔ اپنی ہمجولیاں تھیں اور ہم۔ خوب آرام سے گزری۔ بعد سوا برس کے پھر ساس نے بلاوا بھیجا۔ جی تو ہرگز جانے کو نہ چاہتا تھا، مگر ناچار روانگی کی تیاری کی۔

پاٹودی سے لودہیانہ کو جانا :

اور آخر ماں باپ بہن بھائیوں سے رخصت ہو کر ایک روز لودہیانہ کو روانہ

ہوئی۔ اور رستے کی منزلیں طے کر کے سسرال میں پہنچی۔ اپنی ساس کو جو دیکھتی ہوں تو وہی بدمزاجی، بدزبانی، خود پسندی، جنگجوئی۔ میں نے بہتیرا چاہا کہ اپنا ادب رکھیں اور میری زبان نہ کھلوائیں۔ اول اول تو بہت سا ٹالا، پر وہ کب مانتی تھیں۔ روز کی جھک جھک سے میرا دل جل گیا تھا۔

ساس بہو کا تکرار:

ایک دن یاد نہیں کیا بات تھی۔ اس پر جو وہ اپنی عادت کے موافق جھپٹ کر بولیں۔ بیگم ہو یا کوئی بھی کہا جائیں گی تو ہوا میں نے بھی ایسا ترکی تمام جواب دیا کہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ کیا کرتی کہاں تک سہتی، کلیجے میں آبلے پڑ گئے تھے۔ پھر تو اس کا ڈھب چپ ہوا۔ رفتہ رفتہ اور محل صاحب کو بھی خبر پہنچی۔ انھوں نے میری ساس کو آن کر بہت شرمایا۔ اور کہا "کیوں ہم نہ کہتی تھیں کہ تم ناحق بہو سے سر نہ ہو۔ کرو اب رنجی رہیں۔ دیکھو آخر ناچار ہو کر وہ بھی دو بدو جواب دینے آ گئی نا۔ بڑی شرم کی بات ہے۔ تم نے اپنا وقار اپنے ہاتھوں سے کھویا۔ ابھی کیا ہے، اگر تم اسی طرح روز کی ردوکد رکھو گی تو آئندہ دیکھنا کہ وہ تمھارا کیسا کھوجڑا کھوتی ہے۔ آخر شریف زادی امیر زادی ہے، کوئی پھوہڑی تو نہیں ہے۔" غرض انھوں نے ایسا جھنجھوڑا کہ شرمندگی کے مارے عرق عرق ہو گئیں۔ اس روز سے میرے منہ تو پھر وہ لگی نہیں میرا پیچھا تو چھوٹا۔ گو وہ تادم مرگ میرے خون کی پیاسی رہیں مگر پھر میری طرف کوئی بدزبانی وغیرہ کا قصد نہیں کیا۔ اس پر چند ہی روز گزرے تھے،

بھائی جعفر علی خاں کی شادی کا حال:

میرے بھائی محمد جعفر علی خاں صاحب مرحوم کا بیاہ رچا۔ ان کی برات ددھیال میں آئی۔ کیوں کہ میری ایک سوتیلی نند ان سے منسوب ہوئی تھیں۔ زیادہ اس سبب سے کہ امید تھی بیاہ کے بعد میں بھی بھائی کے ہمراہ اپنے میکے جاؤں گی۔ اس

جب شادی ہو چکی اور برات رخصت ہونے لگی تو بھائی نے آن کر میری ساس سے کہا کہ "اگر آپ اجازت دیں تو میں بہن کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔" پر بوا وہ تو طوطے کی طرح دیدہ بدل گئیں، صاف انکار کر دیا۔ میری سوتیلی ماں اور بھائی نے بہتیری منتیں کیں ہاتھ تک کے جوڑے، انھوں نے ایک نہ سنی۔ اور مجھ کو نہیں بھیجا۔ میں نے رو رو کر بہتیری اپنی نکڑی اڑائی مگر وہ ایسی سنگدل تھیں کہ ذرا بھی نہ پسیجیں۔ ناچار بھائی بیچارے، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ان کے پاس سے اٹھ کر میرے پاس آئے۔ مجھے بہت سے دلاسے دے کر سوار ہو گئے۔ میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی لیکن خدا کے واری جاؤں۔ کہ اس نے میری آہ و زاری اور بے قراری پر رحم کیا اور ایسی داد دی کہ دو مہینے نہ گزرے تھے جو دلہن کی ماں نے میری ساس سے کہا کہ "بوا تم پاٹودی جاؤ اور میری بیٹی کو جا کر لے آؤ۔" ہر چند انھوں نے ٹالے بالے بتائے، مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ اور ایسا دبایا کہ بغیر جائے کچھ بن نہ آیا۔

لودہیانہ سے پاٹودی کو آنا:

غرض لودہیانہ سے روانہ ہوئے اور منزل بمنزل چل کر پاٹودی میں پہنچے۔ میں بھی شکر خدا کا بجا لائی۔ یوں کہ ساس کے ہمراہ اپنے میکے میں آئی۔ وہ پاٹودی آ کر کوئی بیس روز رہیں۔ پھر انھوں نے لودہیانہ کی تیاری کی۔ مجھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا۔ پر میرے ماں باپ نے نہ بھیجا۔ بہتیری تیوری بدلی، ناک بھوں چڑھائی پر کچھ بن نہ آئی۔ اپنا سامنہ لے کر چلی گئیں۔ میں اپنے میکے میں خوش و خرم رہی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میری ساس لودہیانہ کو روانہ ہوئی ہیں تو جمادی الثانی کا مہینہ ۱۲۰۸ھ (۱۸) تھی۔ سو بوا ڈیڑھ دو مہینے تو خوب ہنسی خوشی میں کٹے۔

والد کا بیمار ہونا اور ان کا انتقال کرنا:

شعبان کی بارہویں تاریخ تھی جو سنا کہ ابا جان کو بخار چڑھا۔ اسی وقت بڑی

انا کو خیر صلاح کے لیے بھیجا۔ وہ واپس آئی تو معلوم ہوا کہ بخار بہت شدت کا ہے۔
جب تین روز ابا جان محل میں نہ آئے تو سب گھبرائے کہ خدا خیر کرے۔ دیکھیے کیا
ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ عادت ان کی نہ تھی۔ کیسے ہی بیمار ہوتے مگر محل میں ضرور ہو
جاتے۔ پھر تو مرض کی یہ صورت ہوئی کہ روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ بہتیرے علاج کیے۔
مسہل دی، سب کچھ کیا پر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بخار نے جنبش نہ کھائی۔ یکم رمضان ۱۲۰۸ھ
(۱۹) کو انھوں نے انتقال کیا۔ دن کے نو بجے ہوں گے، جو یکایک باہر سے رونے کی
آواز آئی۔ اماں جان نے گھبرا کر کہا "ارے خدا کے لیے جا کر دیکھو تو سہی کیا ہوا"۔
اتنے میں بڑی انا باہر سے روتی پیٹتی ہوئی اندر آئی۔ اس کے آتے ہی محل میں کہرام
مچ گیا۔ ہر طرف رونے پیٹنے کی آواز بلند ہوئی۔

دادی اماں کی گریہ و زاری دیکھ کر مجھ کو غش آنا:

اور خاص کر دادی اماں کی گریہ و زاری اور بے قراری کو تو سننے اور دیکھنے
کی تاب نہ تھی۔ جس وقت وہ یہ بیان کرتی تھیں کہ "ہائے میرے لعل، میرے گھر کو
بے نور کر گیا۔ ہائے میرے چاند کدھر چھپ گیا۔ ارے میری آنکھوں کے نور، میرے
دل کی تسکین، میرے کلیجے کی ٹھنڈک جاتی رہی۔ ارے میرے فرزند، میرے دل بند،
اکیلا ہی چلا گیا، مجھے تنہا چھوڑ گیا۔ جنگل آباد کیا میرا گھر ویران کر دیا۔ ہے ہے میں
کیا کروں۔ اس کے بغیر کیوں کر جیوں۔" یہ سن کر اپنے تو اپنے، اجنبی بھی اپنے ٹکڑے
اڑاتے تھے۔ میرا یہ حال ہوا کہ پہلے تو میں سہمی ہوئی ششدر تھی، اس لیے کہ مرنا
کسی کا بھی آنکھ سے دیکھا نہ تھا، اب دیکھا تو اپنے باپ کا مرنا۔ اور باپ بھی عاشق
زار باپ۔ بس مجھے، ان پر خدا رحمت نازل فرمائے، کمال ہی درجے [illegible]
تھی۔ میں نے جو دادی اماں کی درد انگیز بین سنی تو ایکا ایکی میرے [illegible] نے [illegible] میری [illegible]
لی اور سارے بدن میں سناٹا سا آ گیا۔ اسی وقت غش کھا کر تڑاق سے زمین پر گری۔
میرے گرتے ہی سب رونا پیٹنا بھول گئے۔ لوگوں کے [illegible] ور بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کوئی

کہتا ہے اب کیا کریں، وہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا، دیکھیے یہ کیا ہوتا ہے، کسی نے گلاب کے چھینٹے دیے۔ کوئی کیوڑا عطر لائی، کسی نے لخلخہ سنگھایا۔ جب دس منٹ میں ہوش آیا، پھر تو میں بھی خوب ہی ڈاڑھیں (دھاڑیں) مار مار کر روئی۔ اور جی میں کہتی تھی کہ ہائے قسمت، سسرال میں تو ساس نے چین نہ لینے دیا، میکے آئی تو یہ سانحہ پیش آیا۔ بیت:

فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا
کہ جس کے عوض یوں رلانے لگا

ادھر ان کی بیویاں بین کر کر روتی تھیں۔ محل میں عجب طرح کا تلاطم پڑا ہوا تھا آخر ان مرحوم کو اول منزل پہنچایا اور پاٹودی میں دفن کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ وہ بڑے نصیب والے تھے۔ ہمارے خاندان بھر میں ایسا خوش نصیب آج تک نہیں ہوا۔ اگرچہ دادا فیض طلب خاں صاحب مرحوم بھی نصیبے کے سکندر ہی تھے، انھوں نے بھی مدت تک ریاست برتی اود عیش کیے مگر اس سے پہلے یہ مرتبہ حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی زحمتیں اٹھانی پڑی تھیں۔ لیکن ابا جان کی عمر ابتدا سے انتہا تک اقبال مندی کے ساتھ عیش میں گزری۔ اور یوں پوچھو تو یہ ساری ثروت وحشمت و ریاست، جو کچھ ہے دادا فیض طلب خاں ہی کا ظہورا ہے۔ کہ انھوں نے بڑی جان جوکھوں کے ساتھ اپنی قوت بازو سے پیدا کیا تھا۔ یہاں اگر ان کا بھی مختصر حال لکھا جائے تو مناسب مقام ہو گا۔ اس لیے لکھا جاتا ہے۔

باب دوم

تاریخ مختصر خاندان پاٹودی

تاریخ مختصر خاندان پاٹودی

وجہ تسمیہ کا بیان:

اصل میں دادا فیض طلب خاں صاحب مرحوم قوم سے پٹھان اور یہ اور ان کے خاندان کے لوگ مشہور شیخان ہیں۔ مگر شیخان مشہور ہونے کی وجہ تسمیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ جب یہ پٹھان تھے تو شیخان کیوں مشہور ہوئے۔ ہر چند معتبر لوگوں سے بھی دریافت کیا اور تاریخ کی کتابوں میں بھی دیکھا مگر کہیں سے اس کی اصلیت نہ معلوم ہوئی۔ آخر اس وجہ سے کہ معلوم تھا کہ دادا فیض طلب خاں صاحب ایک صوفی کامل رکن الدین محمود (۲۰) نامی کی اولاد میں سے ہیں۔ پس تصوّف کی کتابوں کی طرف رجوع کیا گیا۔ الحمد للہ کہ بہت تلاش کے بعد مطلب بخوبی بر آیا۔ اور معلوم ہوا کہ ان کے بزرگوں کے شیخان مشہور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ رکن الدین محمود (۲۱) صوفی خواف کے رہنے والے، جو نیشاپور کے قرب و جوار میں کوئی موضع تھا، حضرت مودود چشتی (۲۲) علیہ الرحمہ کے خلفاء میں سے تھے۔ اور یہ اپنی بزرگی اور صاحب کشف و کرامت ہونے کی وجہ سے پہلے خواجہ شیخان کہلاتے تھے اور اس نظر سے حضرت مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شفقت اور مہربانی کی رو سے ان کو شیخان کا لقب مرحمت فرمایا۔ جیسا کہ کتاب "نفحات الانس" اور "سیر الاقطاب" میں مذکور ہے کہ رکن الدین محمود صوفی اس خطاب پر بہت ناز کرتے تھے۔ اس امر کی تصدیق کے لیے دونوں کتابوں کی عبارت لکھی جاتی ہے۔

عبارتِ "نفحات الانس"

"شاہ شیخان علیہ الرحمہ کہ لقب و نام وے رکن الدین محمود (۲۳) است (۲۴) و چند وقت در چشت اقامت نمودہ ۔ میگویند کہ دروقت (۲۵) اقامت ہرگز درچشت نقض طہارت نہ کردہ ۔ چوں درخواستی (۲۶) کہ طہارت کند سوار شدی ۔ و از چشت بیرون آمدی و دور رفتی و طہارت ساختی و مراجعت نمودی ۔ می گفتی کہ مزار (۲۷) چشت منزل مبارک و مقام متبرک است روا نہ (۲۸) باشد کہ آنجا بے ادبی کنند و گویند کہ پیشتر وے را خواجۂ شیخان می گفت ۔ خواجہ مودود وے را شاہ لقب نہاد ۔ و وے ہمیشہ بان می نازیدی و مفاخرت می کردی ۔ وفات خواجہ مودود سبع و عشرین و خمسمایۃ بودہ است (۵۲۷ھ) (۲۹) و وفات شاہ سبع وتسعین و خمسمایۃ (۵۹۷ھ) (۳۰)۔" صفحہ ۲۱۱

دیگر عبارتِ "سیر الاقطاب"

"شاہِ شیخان (۳۱) کہ اول او را خواجۂ شیخان می گفت (۳۲) روزے از زبان مبارک حضرت خواجہ از روئے مہربانی شاہ شیخان برآمد ۔ ازآن باز بدین خطاب مشہور شد و اندر اقرانِ خود بدین اسم می نازید ۔" صفحہ ۸۸

غرض اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ شیخ رکن الدین محمود اپنی بزرگی کے سبب شیخ اور خواجہ شیخان اور شاہ شیخان کہلائے ۔ ورنہ قوم سے پٹھان تھے ۔ ان کی وفات ۵۹۹ھ (۳۳) میں ہوئی ۔ اور موضع چشت میں دفن کیے گئے ۔ پھر ان کی اولاد میں جو لوگ ہوئے وہ ان کے اس لقب کی وجہ سے شیخان کہلائے۔

ذکر شیخ لالہ حسن پیر ماٹھا کا :

شیخ لالہ حسن مشہور پیر ماٹھا اور زندہ پیر تھے ۔ اور یہ شیخ رکن الدین محمود کے

بارہویں پشت میں پوتے تھے ۔ یہ نواح (کذا) نیشاپور سے آن کر شیر شاہ بادشاہ کے عہد میں شہر سمانہ میں مقیم ہوئے ۔ جو اب ریاست پٹیالہ سے متعلق ہے ۔ اس وجہ سے کہ شیخ لالہ حسن بڑے عابد اور زاہد اور صاحبِ اسرار تھے ۔ یہاں کے پٹھانوں نے ان کی بڑی تعظیم اور توقیر کی ۔ اور صدہا پٹھان ان کا مرید ہو گیا ۔ تھوڑے عرصے کے بعد شیخ لالہ حسن صاحب نے شہر سمانہ کے دو کوس کے فاصلے پر شمائل (شمال) کی جانب ایک گاؤں ہے ۔ جسے مراد پورہ کہتے ہیں ۔ اس زمانے میں شہر سمانے اور مراد پورہ کے بیچ میں کوئی عمارت حائل نہ تھی ۔ جب بڑیچ (۳۴) لوگ آئے تو داؤد خاں بڑیچ (۳۵) نے موضع بڑیچاں اس کے اور شہر سمانے کے بیچ میں آباد کیا ۔ اور مراد پورہ کے شمال میں خداد پورہ آباد ہوا ۔ تو اب اس کی یہ صورت ہے کہ شہر سمانے کے شمال میں ایک میل کے فاصلے پر موضوع بڑیچاں ہے اور موضع بڑیچاں کے شمائل میں کوئی پانسو قدم کے فاصلے پر مرادپورہ ہے اور مراد پورہ کے شمال میں خداد پورہ ہے ۔ یعنی مراد پورہ ، خداد پورہ اور موضع بڑیچاں کے درمیان واقع ہے ۔ اسی گاؤں میں شیخ لالہ حسن یعنی پیر ماٹھا نے سکونت اختیار کی اور اپنی زندگی بھر وہیں مقیم رہے۔

شیخ لالہ حسن کی وفات کا ذکر :

آخر کار اکبر بادشاہ کے عہد سلطنت ۹۰۳ھ (۳۶) میں انھوں نے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے (۳۷) آج تک ان کا مزار وہاں موجود ہے ۔ اور یہ پیر ماٹھا اور زندہ پیر کے نام سے مشہور ہیں ۔ ان کے مزار پر صدہا گھڑا یعنی مٹکا نذر کے طور پر چڑھتا ہے یہی سبب ہے جو ان کو اس نام سے منسوب کیا ۔ یہ بڑے صاحبِ تصرّف تھے ۔ کہتے ہیں کہ آج تک ان کی اولاد میں یہ بات چلی آتی ہے کہ اگر کسی شخص کو باولا کتا کاٹے اور اس شخص کے منہ میں ان کی اولاد میں سے پانی لی کر اپنے منہ میں بھر کر ڈالے تو تمام عمر اس کو ہڑک نہیں اٹھتے اور ان کا یہ تصرّف ان کی اولاد میں تا قیامت رہے گا۔

ذکر شیخ مصطفےٰ کا:

شیخ لالہ حسن کی وفات کے بعد ان کے فرزند شیخ مصطفےٰ ان کے جانشین ہوئے۔ یہ بھی بڑے صالح اور متقی اور صاحبِ علم تھے۔ انھوں نے بھی اپنی ساری عمر درس و تدریس و زہد و عبادت میں بسر کی۔ اور جو ان کے خاندان کا طریقہ تھا، یعنی پیری مریدی کا جاری رکھا۔ اور ان سے بھی بڑا رشد مخلوق کو حاصل ہوا۔ تمام اطراف کے لوگ جوق جوق آن کر ان سے بیعت کرتے تھے اور ہدایت پاتے تھے۔ ان کی وفات ۱۰۰۳ھ (۳۸) میں ہوئی۔ اور اپنے باپ کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ ان کے ایک بیٹا ثابت خاں تھا۔

ثابت خاں کی حقیقت:

ثابت خاں کی طبیعت لڑکپن ہی سے سپہ گری کی طرف مائل تھی۔ پیری مریدی کا جو طریقہ ان کے آباواجداد سے چلا آتا تھا، ان کو اس کی طرف مطلق خیال نہ تھا۔ بلکہ یہ ہمیشہ تیراندازی اور برچھا ہلانے، گھوڑے پر چڑھنے، شکار کھیلنے کا شغل رکھتے تھے۔ جب ۱۰۳۲ھ (۳۹) میں جہانگیر بادشاہ اور اس کے بیٹے شاہجہاں کا باہمی تنازع ہوا اور جہانگیر بادشاہ لاہور سے دلی کی طرف روانہ ہوا (۴۰) تو اثنا، راہ میں ثابت خاں قریب سو سوا سو سوار کی جمعیت سمیت بادشاہ کی فوج میں رسالداری کے عہدے پر مقرر ہو گئے۔ انھیں دنوں میں بادشاہ نے عبداللہ خاں کو دس ہزار سوار کے ساتھ شاہجہاں کے مقابلے کے لیے بھیجا (۴۱)، ان میں ثابت خاں بھی تھے۔ اور یہ بات مشہور ہے کہ عبداللہ خاں دس ہزار سوار سمیت شاہجہاں سے جا ملا (۴۲) اور ثابت خاں اکثر معرکوں میں عبداللہ خاں کے ساتھ رہے۔ جب شاہ جہاں بادشاہ ہوا اور قندھار پر فوج کشی کی تو گرشک کے مقام پر قزلباشوں سے بڑے بڑے میدان ہوئے۔ (۴۳) انھیں معرکوں میں سے ایک لڑائی میں ۱۰۴۲ھ (۴۴) میں ثابت خاں گرشک کے مقام پر کام آئے۔

شیخ جمال اور اسحاق خاں کا حال:

ثابت خاں کے دو بیٹے تھے۔ ایک شیخ جمال، دوسرے اسحٰق خاں۔ شیخ جمال صاحب مشائخِ کبار میں سے ہوئے اور ان کا طریقہ اپنے آباواجداد کے موافق ہوا۔ ان سے خلق اللہ کو بہت فیض پہنچا۔ اور یہ شیخ عبدالخالق لاہوری (۴۵) کے مرید تھے۔ ان کا طریقہ صابری چشتی تھا۔ مگر لاولد تھے۔ ان کی وفات ۱۰۸۸ھ (۴۶) میں ہوئی۔ اور مراد پورہ ہی میں دفن ہوئے۔ اور اسحاق خاں کا حال صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ ان کا ایک فرزند منصور خاں تھا۔

منصور خاں کا حال:

منصور خاں کا حال یہ ہے کہ یہ بہادر شاہ (۴۷) بادشاہ کے عہد میں وزیر خاں چکلہ دار سرہند کے سرکار میں ملازم تھے۔ جب ۱۱۲۳ھ میں گروبند (گروگوبند) (۴۸) نے سرہند پر یورش کی اور وزیر خاں چکلہ دار مارا گیا (۴۹) تو اسی ہنگامے میں منصور خاں کے بائیں ہاتھ میں تلوار کا ایک زخم لگا کہ اس سے ان کے ہاتھ کی تین انگلیاں اُڑ گئی تھیں۔ اس سبب سے یہ ٹنڈے منصور خاں مشہور ہو گئے تھے اور تھے یہ بڑے چست و چالاک۔ ان کی بوٹی بوٹی میں شجاعت بھری ہوئی تھی۔ اس ٹنڈے پن میں بھی نچلے نہ بیٹھتے تھے۔ انھوں نے پیشہ قزاقی اختیار کر لیا تھا۔ اور لوگوں کے دلوں میں ان کی ایسی دہشت بیٹھی تھی کہ جس گاؤں پر یہ چاہتے اکیلے حملہ کرتے تھے اور لوگ ان کی دہشت سے گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ آخر کار ۱۱۲۴ھ (۵۰) میں پیمانۂ عمر ان کا لبریز ہوا اور ایک فرزند دولت خاں نامی چھوڑ گئے۔

دولت خاں کا حال:

دولت خاں کا حال اتنا ہی دریافت ہوا ہے کہ یہ ایک سیدھے سادے

پٹھان تھے ۔ انھوں نے کسی سرکار میں ملازمت بھی اختیار نہیں کی ۔ عمر بھر خانہ نشیں ہی رہے۔ اور بطور زمینداروں کے اپنی گزراوقات کرتے رہے ۔ ایک فرزند ان کے بادل خاں تھے۔

ذکر بادل خاں کا :

بادل خاں کی حقیقت یہ ہے کہ جب مصطفیٰ خان بڑیچ ۰ محمد شاہ (۵۱) بادشاہ کے عہد میں تلاشِ روزگار کے واسطے پانچ چھے ہزار سوار کی جمعیت کے ساتھ ولایت سے (۵۲) ہندوستان کو آتا تھا ۔ جب یہ قریب شہر سمانے کے پہنچا تو سکھوں کا فرقہ اس کا سدِّراہ ہوا۔ اس نے سخت جنگ کے بعد ان کو شکست دی (۵۳) اور شہر سمانے میں بودباش اختیار کی ۔ یعنی موضع بڑیچان جو شہر سمانے اور مراد پورہ کے درمیان داؤد خاں بڑیچ نے آباد کیا تھا ۰ وہاں اپنے قبائل چھوڑ ملازمت حاصل کرنے کے خیال میں منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوا ۔ اس وقت بادل خاں بھی مصطفیٰ خاں بڑیچ کے ہمراہ ہولیے ۔ یہ اپنی جمعیت سمیت جا کر نواب علی وردی خاں مہابت جنگ (۵۴) صوبہ بنگالہ کی سرکار میں ملازم ہو گیا ۔ ایک عرصے کے بعد جب مہابت جنگ اور مصطفیٰ خاں کی ناچاقی (۵۵) ہوئی تو مصطفیٰ خاں ملازمت ترک کرکے مرشد آباد سے روانہ ہوا (۵۶) ۔ راستے میں اس نے قلعہ مُنگیر (مونگیر) کا محاصرہ کیا (۵۷) ۰ ہرچند قلعہ دار منگیر بھی خوب لڑا پر آخرکار مارا گیا ۔ اور قلعہ منگیر اس نے فتح کر لیا۔ (۵۸) لیکن مصطفیٰ خاں کا بھائی عبدالرّسول خاں (۵۹) اور بادل خاں یہ دونوں اس لڑائی میں کام آئے ۔ بادل خاں کے ایک فرزند الف خاں تھے ۔ (۶۰)

الف خاں کی حقیقت :

الف خاں کچھ عرصے تک تو نواب منصور علی خاں (۶۱) صوبہ اودھ کی سرکار میں ملازم رہے، پھر وہاں سے نوکری چھوڑ کر دلی چلے آئے۔ اور یہاں ایک عرصے تک

قیام کیا ۔ (۶۲) نواحِ دلی میں مغل پورہ ، جو ایک بستی ہے ، اس میں مرزا فاضل بیگ ایک مغل رہتے تھے ۔ ان کی بیٹی سے شادی کی ۔ ان کی اس بی بی کے بطن سے میرے دادا فیض طلب خاں صاحب پیدا ہوئے۔ ان کی ایک بی بی وطنِ مالوفہ یعنی شہر سمانے میں بھی تھیں ۔ ان کے بطن سے ایک بیٹا تھا ، جس کا نام غلام رسول خاں تھا ۔ کچھ مدّت کے بعد ۱۲۰۲ھ (۶۳) میں الف خاں صاحب نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اور دو فرزند انھوں نے چھوڑے ۔ بڑے غلام رسول خاں اور چھوٹے فیض طلب خاں ۔

غلام رسول خاں اور ان کی اولاد کا حال :

غلام رسول خاں اور ان کی اولاد کا حال یہ ہے کہ ان کا بیٹا عبدالرّسول خاں اور ان کا بیٹا محمد ابراہیم علی خاں۔ محمد ابراہیم علی خاں کو رئیس جھجر نے عبدالصّمد خاں فوج ریاست کے جرنیل سمیت سواروں کی ایک جمعیت کے ساتھ ۱۸۵۷ء میں بادشاہ کی مدد کے لیے دلی بھیجا تھا۔ چنانچہ اسی جرم میں محمد ابراہیم علی خاں کو انھیں دنوں میں مقام جھجر پھانسی دی گئی ۔ ان کے چار بیٹے ہیں: محمد اشرف خاں ، محمد اسماعیل خاں ، محمد خاں ، عبدالستار خاں ۔ ان کو سرکار انگریزی کی طرف سے وظیفے کے طور پر کچھ ملتا ہے۔ محمد اشرف خاں کے ایک بیٹا عشرت علی خاں ہے ۔ محمد اسماعیل خاں کے دو فرزند ہیں: احمد علی خاں اور ولایت علی خاں ۔ محمد خاں کے ایک بیٹا معین الدین خاں ہے ۔ عبدالستار خاں کے کچھ اولاد نہیں ہے ۔

اب کچھ حال ریاست پاٹودی کا لکھا جاتا ہے :

پاٹودی ایک قصبہ دلی سے چوبیس کوس اور گوڑگاؤں سے بارہ کوس کے فاصلے پر جنوب کی طرف واقع ہے ۔ اور اوسط درجے کے رئیس بااختیار کی ریاست گاہ ہے ۔ یہ رئیس سرکار انگریزی کے سایۂ عاطفت میں سرداری کرتا ہے اور اس کی ریاست کمشنری دلی سے متعلق ہے ۔ اور جناب صاحب کمشنر بہادر قسمت دلی اس

کے نگراں ہیں (۶۴) ۔ اس وقت اس ریاست کا رئیس (۶۵) اپنی نو عمری کے سبب بے اختیار ہے ۔ اور لاہور چیف کالج میں تعلیم پاتا ہے ۔ ریاست کے اہتمام پر ایک منتظم سرکار انگریزی کی طرف سے مقرر ہے۔ یہاں کے اوّل رئیس جو خاندانِ شیخان میں سے ہوئے، وہ نواب فیض طلب خاں صاحب مرحوم رئیسِ حال کے مورثِ اعلیٰ تھے۔

فیض طلب خاں اور نجابت علی خاں کا حال :

کہتے ہیں کہ نواب فیض طلب خاں صاحب بڑے شجاع اور قوی ہیکل اور شکیل جوان تھے ۔ ان کی شادی نواب نجابت علی خاں (۶۶) رئیسِ اوّل جھجر کی بہن سے ہوئی تھی (۶۷) اور فیض طلب خاں ہمیشہ نواب نجابت علی خاں ہی کے ساتھ رہے ۔ نجابت علی خاں ابتداء میں شاہ عالم بادشاہ کے حضور میں ایک جاگیردار تھے ۔ جب مادھوراؤ سندھیا (۶۸) کا تسلّط دہلی پر ہوا ، تو اس نے بھی ان کی قدر اور منزلت بحال رکھی ۔ اور انھوں نے بھی اس کی اطاعت اور خیر خواہی کا بخوبی حق ادا کیا۔ جب ملک جے پور میں راجہ دہراج پرتاب سنگھ کچھوا (۶۹) پر مادھوراؤ سندھیا نے چڑھائی کی (۷۰) اور قصبہ لال سوت (۷۱) اور خوشحال گڑھ پر لڑائی ہوئی (۷۲) تو نجابت علی خاں کے ہمراہیوں نے بھی میدانِ جنگ میں نہایت درجے کی داد شجاعت کی دی۔ چنانچہ غازی خاں ، نجابت علی خاں کا چچا اس معرکے میں مارا گیا اور دادا فیض طلب خاں صاحب سے بھی اس جنگ میں بڑے بڑے کارِنمایاں ہوئے ۔ اسی کارگزاری اور خیر خواہی کے صلے میں مادھوجی سندھیا نے نجابت علی خاں کو بادشاہ کے حضور سے " اسد الدّولہ ، ممتاز الملک ، نواب نجابت علی خاں بہادر ہزبر جنگ " کا خطاب دلوایا (۷۳)

جاگیر کی سند ملنے کا حال :

جب ۱۲۱۸ھ اور ۱۸۰۳ء میں سرکار انگریزی کی عملداری دہلی میں ہو گئی تو

نواب نجابت علی خاں نے جرنیل لارڈلیک صاحب بہادر کی اطاعت قبول کر کے اپنی جاگیر سابقہ کی ایک سند حاصل کی (۴۰) اس کے بعد جب ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء میں انگریزی فوج جرنیل منسن صاحب (۵۰) بہادر کے ماتحت جسونت راؤ ہلکر کے دفیعے کے لیے روانہ ہوئی تو نواب نجابت علی خاں نے بھی پانسو سوار اپنے بہنوئی فیض طلب خاں صاحب کی سرداری میں جرنیل صاحب کے ساتھ کر دیے۔ اور سکندرہ (مکندرہ؟) کی گھاٹی کے مقام پر فوجِ ہلکر سے مقابلہ ہوا۔ اور بڑے گھمسان کا رن پڑا (۶۰) اس جنگ میں اگرچہ فوج انگریزی نے زک پائی اور ایک افسر بورکین (۷۰) صاحب مارا بھی گیا (۸۰) ۔لیکن دادا فیض طلب خاں صاحب سے عجیب جواں مردی و ثابت قدمی و خیر خواہی ظاہر ہوئی۔ ان کا سارا بدن زخموں سے گل رنگ ہو گیا (۹۰) ۔ بلکہ اسی حالت میں یہ فوجِ ہلکر میں پکڑے بھی گئے اور آخر کو محمد اعظم سردار ہلکر کی سفارش سے انھوں نے وہاں سے رہائی پائی۔ (۸۰) چنانچہ اسی کارگزاری و حسنِ خدمات کے صلے میں لارڈلیک صاحب بہادر نے دادا فیض طلب خاں صاحب کو پاٹودی کا پرگنہ جاگیر کے طور پر عنایت فرمایا۔ اور اس کی سند مرقومہ ۲۴ اکتوبر ۱۸۰۴ء مطابق ۱۹ رجب ۱۲۱۹ھ ان کو عطا ہوئی۔ اور نواب نجابت علی خاں صاحب کو محالات جھجر و کانونڈ (۸۱) وغیرہ کی ۔ جو لارڈ لیک صاحب بہادر نے دوسری سند ۱۰ مارچ ۱۸۰۶ء میں نسلاً بعد نسلٍ مرحمت فرمائی (۸۲) " تاریخِ جھجر " (۸۳) والا لکھتا ہے کہ یہ فیض خاں صاحب کی جاں نثاری کا سبب تھا۔

فیض طلب خاں اور نجابت علی خاں کا اتفاق :

نواب نجابت علی خاں صاحب مرحوم اور دادا فیض طلب خاں صاحب آپس کے حُسنِ سلوک اور باہمی قرابتِ قریبہ و اتفاق ہونے کے سبب سے سرکار انگریزی سے عطیہ مُلک جداگانہ حاصل کرنے کے بعد بھی ۔ دونوں صاحب ایک ہی جگہ رہے۔ اور اس نظر سے کہ نجابت علی خاں صاحب ایک سیدھے سادے سپاہی

زادے تھے ۔ انھیں ریاست کرنے کے کام میں زیادہ مداخلت نہ تھی ۔ بس دونوں ریاستوں کا بندوبست و عزل و نصب فیض طلب خاں صاحب کے اختیار میں رہا۔

فیض طلب خاں صاحب کا دوسری شادی کرنا اور نواب محمد اکبر علی خاں صاحب کا پیدا ہونا:

چند روز کے بعد ۱۲۲۳ھ (۸۴) میں فیض طلب خاں صاحب کی زوجہ یعنی ہمشیرہ نواب نجابت علی خاں اس عالم فانی سے انتقال کر گئیں تو انھوں نے ۱۲۲۴ھ (۸۵) میں الہ آباد کے ایک عالی خاندان سیدات نیشاپوری میں حکیم میر عبداللہ کی دختر یعنی لاڈو بیگم صاحبہ سے شادی کی ۔ چنانچہ ان کے بطن سے ۲۵ شعبان ۱۲۲۹ھ (۸۶) کو میرے آبا جان نواب محمد اکبر علی خاں صاحب پیدا ہوئے ۔ سُنا ہے کہ نواب فیض طلب خاں صاحب نے بڑی خوشی کی تھی اور ان کی چھٹی میں کئی لاکھ روپیہ صرف کیا تھا۔

نجابت علی خاں کا انتقال کرنا اور فیض طلب خاں کا علیحدہ ہونا :

جب نجابت علی خاں صاحب نے ۱۲۲۹ھ (۸۷) میں وفات پائی اور نواب فیض محمد خاں صاحب (۸۸) ریاست جھجر کے مسند نشیں ہوئے تو ان کے اور دادا فیض طلب خاں صاحب کے درمیان تنازع پیدا ہوا ۔ اور آخر کار یہ ان سے آزردہ ہو کر اپنی ریاست گاہ یعنی پاٹودی چلے آئے۔ (۸۹) اور پھر تا دمِ زیست یہیں رہے۔

نواب فیض طلب خاں صاحب کے عادات اور وفات کا حال :

نواب فیض طلب خاں صاحب فیاضی میں اسم با مسمیٰ تھے ۔ سخاوت ، مروّت

، دوست پروری ، نیک بختی ، خوش اوقاتی کی صفتوں کے ساتھ موصوف تھے ۔ ان کی سخاوت کا یہ حال سنا ہے ۔ روزینہ معمولی خیرات کے علاوہ سو یا سوا سو روپیہ شب کو ہمیشہ ایک رومال میں باندھ کر اپنے پاس رکھ لیا کرتے اور علی الصّباح محتاجوں کو تقسیم کرا دیتے تھے ۔ اس کے سوا جاڑے کے موسم میں مسکینوں کو لحاف تقسیم کرتے تھے ۔ اکثر غریبوں کی بن بیاہی بیٹیوں کی شادی کے سامان کے لیے روپیہ دیتے تھے ۔ قدردان اور دوست پرور ایسے تھے کہ اپنے وفادار متعلقین کے ساتھ علاوہ تنخواہ ماہواری کے انعامات کا طریقہ بھی جاری رکھتے۔ خاص کر حکیم ثناء اللہ خاں مرحوم (۹۰) اور دریا خاں اور حکیم فتح اللہ خاں (۹۱) کرنیل شیخ منگلو جیسے عزّت دار لوگوں کے ساتھ بڑی خاطر داری سے پیش آتے تھے اور ان سے ایسا برتاوا برتتے تھے جیسا کوئی اپنے قرابتیوں کے ساتھ برتتا ہے ۔ چنانچہ ان کی شادی غمی میں بذاتِ خود جاتے تھے اور ہر ایک کے ساتھ ان کی حیثیت کے موافق وجہ نقد سے سلوک کرتے تھے (۹۲) ۔ نیک بخت ایسے تھے کہ تمام عمر بُرے کام کے پاس نہیں پھٹکے ۔ روزہ نماز کے ایسے پابند کہ کبھی قضا نہ کرتے ۔ گورنمنٹ عالیہ سے عطیہ ملک حاصل کرنے کے بعد چھبیس (۲۶) برس ریاست کی ۔ آخر کار بخار کے عارضے سے ۱۲۴۵ھ (۹۳) میں عُقبیٰ کا سفر اختیار کیا اور روشن چراغ (۹۴) دلی میں دفن ہوئے ۔ جب دادا صاحب کا انتقال ہوا ہے تو اس وقت میرے ابّا جان نواب محمد اکبر علی خاں صاحب مرحوم کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی جو مسند نشینِ ریاست ہوئے۔

نواب محمد اکبر علی خاں صاحب کی خصلت کا بیان :

میرے والد ماجد نواب محمد اکبر علی خاں صاحب بھی سخاوت کی صفت میں گویا اپنے زمانے کے حاتِم ثانی تھے۔ (۹۵) ہر بہانے دیتے تھے اور اپنی بساط سے بڑھ کر دیتے تھے ۔ جب دینے کو کچھ پاس نہ ہوتا تھا تو بڑے اُداس ہوتے ۔ ان کی اداسی ان کی تنگ دستی کا نشان تھی۔ ان کو صرع کا مرض تھا ۔ کبھی ہفتہ اور کبھی ماہوار اس کا

دورہ ہوتا تھا ۔ گو وہ اپنے ارادوں ، عادتوں ، طریقوں میں بڑے مستقل مزاج تھے لیکن پھر بھی اس مرض نے ان کے مزاج میں ایک عجیب رنگ پیدا کر دیا تھا ۔ اور ایک نئی قسم کی خصلت پڑ گئی تھی۔ یعنی جب سب کچھ دے دلا کر ان کے پاس کچھ نہ رہتا تھا تو ان کی طبیعت میں اداسی پیدا ہو کر ایک جوش اُٹھتا اور وہ غصّہ بعض مصاحبین وغیرہ پر اُترتا ان پر ایسی خفگی ہوتی کہ ان کی برطرفی تک کی نوبت پہنچتی ۔ اور معزولی کے بعد حکم ہوتا کہ ابھی صدرِ ریاست سے خارج ہو جاویں ۔ اور بعد خارج کرنے کے اکثر ان کے مکانات کھدوا کر پھکوادیتے۔ مگر اپنی لازمی صفت سخاوت کے اس باب میں بھی رعایت ملحوظ رکھتے۔ یعنی ان کو علاوہ تنخواہ کے زادِراہ کے طور پر اگر ممکن ہوتا تھا تو کچھ مدد خرچ دیتے تھے ۔ پھر جہاں وہ جوش اتر چکتا، فوراً اس نکالے ہوئے کی پھر بلانے کی اُمنگ جی میں اُٹھتی ۔ اسی وقت چپراسی بھیجا جاتا ۔ اگر کوئی معزّز آدمی ہے تو سوار چلا جاتا۔ اس سے بھی مُقرّب ہے تو اس کے لینے کو ایک دو مصاحب روانہ ہوتے ۔ سانڈنی سوار دوڑتے ۔ غرض جس طرح ہو سکتا تھا بلاتے تھے ۔ اور پھر اس سے اپنا قصور معاف کراتے ۔ اس کو زرنقد پوشاک انعام میں دیتے اور عمدہ کھانے اپنے خاص باورچی خانے سے بھجواتے تھے۔ اور ہر طرح سے خوش کرتے تھے ۔ اسی وجہ سے اکثر لوگ یہ آرزو کیا کرتے تھے کہ ہم جلدی جلدی معزول ہوا کریں ۔ تاکہ پھر معمولی مدارات کے ساتھ بلائے جائیں۔ اور خلعت و انعام پاویں ۔ اسی وجہ سے بعض لوگ ان کو مراق کا مرض بھی بتاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کا کوئی مُقرّب ملازم ایسا نہ تھا جو دو چار مرتبہ نکالا نہ گیا ہو۔ سوائے حکیم فتح اللہ خاں صاحب مرحوم کے ، کہ ان کا وہ بڑا لحاظ اور توقیر کرتے تھے۔ چنانچہ سنا ہے کہ دادا فیض طلب خاں صاحب نے میرے ابّا جان کو یہ وصیت کی تھی کہ حکیم فتح اللہ خاں کو تم میرے بعد میری جگہ سمجھنا۔ اور ایسے رفیق کو ہرگز جدا نہ کرنا ۔ سو حقیقت میں ان مرحوم نے ایسا ہی کیا ۔ بلکہ انھوں نے حکیم صاحب مرحوم کے اکثر رشتے داروں اور عزیزوں کو رکھا اور ان کے بعد ان کے ایک نواسے کو ان کی جگہ طبابت کے عہدے پر مقرّر کیا ۔ اور بڑی عزّت کے ساتھ رکھا ۔ مگر

زمانے کا انقلاب ایسا ہوا کہ ریاست کے کاروبار میں اب وہ لوگ دخیل ہوئے جنھوں نے حکیم صاحب مرحوم کے خاندان میں سے ایک متنفس کو بھی کاروبارِ ریاست پر بحال نہ رکھا۔ یا بڑے بڑے کاموں پر وہ لوگ متعین تھے!

میرے ابّا جان رحم دل ایسے تھے کہ کسی کے دکھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا، اس کی تکلیف دفع کرنے میں کوشش کرتے تھے۔ ان کی تمام رعایا اور ملازم اور اولاد تا دمِ زیست ان سے سب خوش رہے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں مسند نشینِ ریاست ہوئے۔ یوں چونتیس، پینتیس برس ریاست کی۔ پچاس برس کی عمر میں دنیا سے سدھارے۔ خدا رکھے بیٹے، بیٹیاں، پوتی، پوتیاں، نواسے، نواسیاں سو آدمیوں کا کنبہ بھرا ہوا چھوڑا۔ ایسا خوش نصیب تو لاکھوں آدمیوں میں سے بھی شاید کوئی ہو گا۔

بیٹوں کا حال:

میرے ابّا جان کے پانچ بیٹے تھے۔ سب سے بڑے نواب محمد تقی علی خاں صاحب یہ ابّا جان کے انتقال کے بعد مسند نشینِ ریاست ہوئے تھے۔ ان کا تذکرہ آگے آوے گا۔ ان سے چھوٹے محمد اصغر علی خاں ان سے چھوٹے محمد جعفر علی خاں۔ یہ تینوں ابا جان کی وفات کے بعد فوت ہو گئے۔ محمد صادق علی خاں اور محمد عنایت علی خاں، یہ دونوں اللہ رکھے زندہ ہیں۔ خدا ان کو زندہ رکھے۔ اور ان کی اولاد کے کھیڑے بسائے۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ان کو وثیقے کے طور پر ریاست سے ملتا ہے۔

بیٹیوں کا حال:

بارہ بیٹیاں صغریٰ بیگم، کبریٰ بیگم، کلثوم بیگم، سکینہ بیگم، زہرہ بیگم یہ عاجزہ یعنی شہر بانو بیگم، سلطان زمانی بیگم، امامی بیگم، سکندر بیگم، ملکہ بیگم، انور بیگم، باقری بیگم۔ ان سب کا وثیقہ ریاست سے ساٹھ ساٹھ روپیہ ماہوار مقرر ہے۔ ان میں تین

بیٹیاں یعنی کبریٰ بیگم، کلثوم بیگم اور ملکہ بیگم فوت ہو گئیں۔ اور نو اس وقت زندہ موجود ہیں۔

بیویوں کا حال:

اور بارہ بیویاں چھوڑی تھیں۔ پہلی شادی بیگم صاحبہ۔ یہ بیاہتا بیوی تھیں۔ ان کے بطن سے صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی، وہ خورد سالی ہی میں فوت ہو گئی تھی۔ ان کو دو سو روپیہ ماہوار ریاست سے ملتا تھا۔ دوسری سرفراز محل۔ یہ بھی منکوحہ تھیں۔ میرے بڑے بھائی جان نواب محمد تقی علی خاں صاحب مرحوم، جو ابّا جان کی وفات کے بعد مسند نشینِ ریاست ہوئے تھے، اور ایک بیٹی صغریٰ بیگم، یہ دونوں ان کے بطن سے تھے۔ اور اس وجہ سے یہ رئیس کی ماں تھیں۔ سو روپیہ ماہوار ریاست سے ان کو وثیقہ ملتا تھا۔ تیسری والدہ محمد اصغر علی خاں۔ چوتھی والدہ جعفر علی خاں۔ پانچویں والدہ محمد صادق علی خاں۔ چھٹی والدہ کبریٰ بیگم۔ ساتویں والدہ کلثوم بیگم۔ آٹھویں والدہ سکینہ بیگم۔ نویں والدہ عاجزہ یعنی شہر بانو بیگم۔ یہ بھی منکوحہ ہیں اور نواب صاحب یعنی والد مرحوم کے حینِ حیات تک انکو ایک سو ستر روپیہ ماہوار ملتا رہا مگر ان کی ترش مزاجی نہایت درجے کی تھی۔ اور نواب صاحب ان کی ترش مزاجی سے اکثر ناراض رہتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے اپنے وصیت نامے میں ان کا وثیقہ اوروں کے برابر پچاس روپیہ ماہوار لکھ گئے۔ چنانچہ بعد وفات نواب صاحب منجملہ ایک سو ستر روپیے کے پچاس روپیہ ماہوار ان کو ملتا ہے۔ دسویں والدہ اماّی بیگم، گیارہویں والدہ انور بیگم۔ بارہویں والدہ باقری بیگم۔ بعد انتقال نواب صاحب شادی بیگم صاحبہ اور والدہ محمد تقی علی خاں صاحب اور والدہ اصغر علی خاں اور والدہ کبریٰ بیگم، یہ چار فوت ہو گئیں۔ اور آٹھ اس وقت تک زندہ موجود ہیں۔ پچاس پچاس روپیہ ماہوار ان کو وثیقہ ریاست سے ملتا ہے۔

بیٹوں کی اولاد کا حال :

نواب محمد تقی علی خان صاحب کے ایک بیٹا نواب محمد مختار حسین خاں تھا، سو وہ اپنے باپ کی وفات کے بعد مسند نشینِ ریاست ہوا۔ اس کا تذکرہ آگے آوے گا۔ محمد اصغر علی خاں صاحب کے ایک دختر سعادت النساء تھی۔ پہلے باپ کا انتقال ہوا، ان کے بعد وہ بھی فوت ہو گئی۔ محمد جعفر علی خاں صاحب، ۱۸۷۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے دو فرزند ہیں۔ ایک کا نام مظفّر علی خاں اور دوسرے کا نام وصیت علی خاں اور ایک دختر ہے۔ محمد صادق علی خاں صاحب کے ایک فرزند محمد حبیب الرّحمان خاں اور ایک دختر ہے۔ محمد عنایت حسن خاں صاحب کے دو فرزند ہیں۔ ایک کا نام محمد حسن خاں اور دوسرے کا نام محمد حسین خاں اور ایک دختر ہے۔

بیٹیوں کی اولاد کا حال:

صغریٰ بیگم کے ایک فرزند عبدالحمید خاں ہے۔ کبریٰ بیگم کے چار فرزند ممتاز علی خاں، مبارک علی خاں، حشمت علی خاں، ناصر علی خاں اور دو بیٹیاں ہیں۔ کلثوم بیگم کے ایک دختر حسن زمانی بیگم ہے۔ سکینہ بیگم کے ایک فرزند معین الدین خاں اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ زہرا بیگم کے ایک فرزند محمد اسحاق خاں ہے۔ امامی بیگم کے ایک فرزند عباس علی خاں اور چار بیٹیاں ہیں۔ سکندر بیگم کے ایک فرزند ارشاد علی خاں اور دو بیٹیاں ہیں۔ ملکہ بیگم کے ایک دختر افضل بیگم ہے۔ باقری بیگم کے چار بیٹیاں ہیں۔ میرے ابّا جان نواب محمد اکبر علی خاں صاحب کی یہ اولاد ہے۔

نواب محمد تقی علی خاں کا مسند نشین ہونا اور ان کا فوت ہونا :

بس جب والد کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ میرے بڑے بھائی جان نواب محمّد

تقی علی خاں صاحب مسند نشینِ ریاست ہوئے ۔ مگر ان کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی ۔ کہ مسند نشیں ہونے کے صرف تین مہینے وہ بھی چند در چند امراض کی حالت میں زندہ رہے۔ چھٹی تاریخ بقر عید کی تھی کہ وہ بھی دنیا سے رحلت کر گئے ۔ اور اپنے باپ ہی کے پہلو میں دفن ہوئے ۔ ان کا داغ بھی ہمارے کلیجوں پر نقش ہو گیا ۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت نصیب کرے ۔ چوبیں برس کی عمر تھی ۔ اچھی طرح جوانی کا سکھ بھی تو نہ دیکھا۔ اگرچہ میرے والد بزرگوار کے مرنے کا لوگوں کو بڑا غم ہوا تھا ، کیوں کہ سخاوت میں وہ اپنے زمانے کے حاتم تھے ، مگر اس مرنے والے نے بھی اپنی نوابی کے عہد میں ایک ایک کی ایسی دل جوئی اور شفقت عام کی تھی کہ والدِ مرحوم کا داغ لوگوں کے دلوں سے مٹا دیا تھا ۔ اور تین مہینے میں ریاست میں ایسی بہار آ گئی تھی کہ لوگ عش عش کرتے تھے۔ اور یہی مرزا ایوب بیگ ، جو اب میرے ہاں مختار ہیں ، میرے بھائی جان نواب محمد تقی علی خان صاحب مرحوم کے عہد میں ریاست کے مدارالمہام تھے ۔ ان کے حسن انتظام سے ریاست کے کل کارخانوں میں رونقِ تازہ آ گئی تھی۔ مگر افسوس کہ وہ بہار زیادہ نہ رہی ۔ اور تھوڑی ہی مدت میں آخر ہو گئی ۔ وہ بھی ایک زمانہ تھا جو خواب و خیال ہو گیا ۔ ہم اچھی طرح ابا جان کا غم نہ بھولتے تھے کہ بھائی جان کا صدمۂ جانکاہ اٹھانا پڑا ۔ بیت :

بھرے تھے نہ پہلے ہی زخمِ جگر
دیا آسماں نے یہ داغِ دگر

مختار حسین خاں کا مسند نشیں ہونا :

بھائی کے انتقال کے بعد ان کا فرزند نواب محمد مختار حسین خاں ، جس کی عمر آٹھ برس کی تھی مسند نشینِ ریاست ہوا۔ (۹۶) اور میرے منجھلے بھائی محمد اصغر علی خاں صاحب مرحوم منتظمِ ریاست ہوئے ۔ (۹۷) یہ کچھ خوش انتظام نہ تھے ۔ ان کی غفلت سے ریاست کے کاروبار میں ابتری پڑی اور آپس میں نزاع پیدا ہوئے ۔ تمام

بیگمات ان سے آزردہ ہو کر دلی چلی آئیں۔ اور یہاں آ کر نالشی ہوئیں ۔ غرض چار پانچ برس وہ ریاست کے منتظم رہے ۔ بس یہی تکا فضیحتی ہوتی رہی ۔ آخر یہ ہوا کہ ان کی بے پروائی اور بدنظمی سے فوج کی تنخواہ کئی مہینے کی چڑھ گئی ۔ اور تنگ ہو کر فوج کے ایک جتھے نے ان کے ایک کارندے کو ایک دن پکڑ لیا اور بے آبرو کیا۔

اصغر علی خاں کا موقوف ہونا اور صفدر حسین خاں کا منتظم ہونا

آخر کار جناب مکنیل (۹۸) صاحب بہادر کمشنر دلی نے ۱۸۶۶ء میں اصغر علی خاں صاحب کو بدنظمی سے موقوف کر کے ڈپٹی صفدر حسین خاں (۹۹) صاحب کو ان کی جگہ منتظم ریاست مقرر کر کر بھیج دیا ۔ ڈپٹی صفدر حسین خاں صاحب نے ریاست کا انتظام نہایت عمدہ کیا ۔ ریاست جو مقروض ہو گئی تھی وہ قرضہ بھی سب ادا کر دیا بلکہ سوا لاکھ روپیہ بنک میں جمع کر دیا ۔ ڈپٹی صاحب پانچ سال منتظم ریاست رہے ۔ آخر ۱۸۷۱ء میں ان کی تبدیلی ہو گئی۔

مولوی حسام الدین کا منتظم ہونا اور رئیس کا آوارہ ہونا:

ان کی جگہ ایک تحصیل دار صاحب مولوی حسام الدین منتظم ریاست مقرر ہوئے ۔ ان کے وقت میں نواب محمد مختار حسین خاں رئیس کے چال و چلن میں ، جو حدِ بلوغ کو نہ پہنچنے کے سبب بے اختیار محض تھا ، بہت فتور آ گیا ۔ پس مولوی صاحب ریاست کے انتظام کی طرف ملتفت رہے ۔ وہاں رئیس اندر ہی اندر صحبتِ بد میں مبتلا ہو کر ناؤنوش و عیاشی کرنے لگا ۔ مولوی صاحب شاید یہ سمجھے

محتسب را دردنِ خانہ چہ کار

روپیہ نقد تو اس کے پاس تھا نہیں ، کیوں کہ منتظم اپنی تحویل میں رکھتا تھا ، رئیس نے قرض لینے پر کمر باندھی ۔ دینے والوں نے جان لیا کہ ایک دن اختیار ملے ہی گا ۔ دوسرے ، ریاست کا رئیس ہے ، دستخطی نوشت لو ، اور بے کھٹکے روپیہ دو ۔ جو

مانگا سو دیا اور جو دیا اُس سے چوگنا لکھوا لیا ۔ چند ہی روز میں قریب تیس چالیس ہزار روپیے قرضہ کر لیا ۔ رفتہ رفتہ منتظم صاحب کو بھی خبر پہنچی ۔ سُنتے ہی ہوش اڑ گئے اور اپنی بدانتظامی کا خیال آیا ۔ انھوں نے جھٹ صاحب کمشنر بہادر کو اطلاع دی ۔ کری کرافٹ صاحب (۱۰۰) کا زمانہ تھا ۔ صاحب بہادر نہایت درجہ کے آسانی پسند اور نیک خو حاکم تھے ۔ سن کر بہت ہی برافروختہ ہوئے اور فوراً کارِ ریاست کو اپنے محکمہ سے علیحدہ کرکے صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر گوڑگانوں کے ماتحت کر دیا۔

آلیور صاحب کا اجنٹ ہونا اور حسن محل کا نکاح ہونا :

اب الیور صاحب (۱۰۱) ڈپٹی کمشنر بہادر گوڑگانوں ریاست کے اجنٹ مقرر ہوئے ۔ اور مولوی حسام الدین صاحب کی تبدیلی ہو کر ان کی جگہ خدا بخش تحصیل دار صاحب منتظمِ ریاست ہوئے ۔ اس پر چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک تازہ گُل اور کھلا ۔ وہ یہ کہ نواب محمد مختار حسین خاں صاحب نے ایک طوائف کے ساتھ عقدِ نکاح باندھ اس کو حسن محل خطاب بھی عنایت کر دیا (۱۰۲) یہ سن کر منتظم صاحب کی تو بہت سِٹّی بھولی ۔ گھبرائے اور فوراً صاحب اجنٹ بہادر کو اطلاع دی ۔ سنتے ہی صاحب بہادر پاٹودی پر تشریف لائے اور بہت چیخے چلائے ۔ مگر پھر کیا ہو سکتا تھا ۔ وہاں تو نکاح بندھ چکا تھا اور پختگی ہو چکی تھی ۔ خیر جو لوگ شریکِ نکاح ہوئے تھے کسی پر ملامت کی، کسی کو تعلقِ ریاست سے خارج کیا ۔ پر جو ہونا تھا وہ ہو لیا ۔ صاحب بہادر تنبیہ و تادیب کرکے چلے گئے۔

دادی اماں کا انتقال کرنا:

اس قصّے کے تھوڑے دن بعد ۱۴ شوال ۱۲۹۳ھ (۱۰۳) کو ہماری جدّہ جناب لاڈو بیگم صاحبہ کو قضائے الٰہی سے سفرِ آخرت درپیش آیا ۔ گو ان کی عمر نوّے سال کی تھی لیکن پھر بھی ان کا دم ہم سب کے لیے اور خاص کر رئیس نو عمر کے واسطے بہت

غنیمت تھا۔ محمد مختار حسین خاں رئیس کو انھوں نے پالا تھا اور ان کا ان کو کسی قدر دباؤ بھی تھا۔ بس دادی صاحبہ مکرمہ کے انتقال کے بعد تو وہ بالکل ہی بے باک ہو گئے۔

ممّو خاں کا اتالیق مقرر ہو کر موقوف ہونا:

جب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر نے ان کی بے اعتدالیاں حد سے زیادہ سُنیں تو اپنے ایک رفیق ممّو خاں نامی کو نوجوان نواب صاحب کا اتالیق مقرر کر کے بھیج دیا (۱۰۴) چند ہی روز کے بعد رئیس کی اتالیق سے بگڑی۔ انھی دنوں میں جناب کرنل ڈیوس صاحب (۱۰۵) بہادر کمشنر دلی مقرر ہو کر آئے۔ اور نواب محمد مختار حسین خاں بہادر بھی جناب صاحب کمشنر بہادر کی ملاقات کو گئے۔ صاحب بہادر نے ان سے حال دریافت فرمایا۔ انھوں نے اتالیق وغیرہ کی خوب شکایت کی۔ اس پر صاحب کمشنر بہادر نے اتالیق کو موقوف کر دیا۔ اور ریاست کا کام گوڑ گانوں سے علیحدہ کر کے پھر کمشنری سے متعلق کر لیا۔

پنڈت کشن لعل صاحب کا ملازم ہونا:

انھی دنوں میں پنڈت کشن لعل (۱۰۶) صاحب بھی کسی کی سفارشی چٹھی لے کر جناب صاحب کمشنر بہادر کی خدمت میں پہنچے۔ صاحب کمشنر بہادر نے ایک چٹھی یا مراسلہ نواب محمد مختار حسین خاں کے نام لکھا کہ یہ پنڈت جی آپ کے نمک خوار قدیمی ہیں۔ ان کو آپ پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ دیا کریں اور یہ اتالیق کے طور پر آپ کے پاس رہیں گے۔ ان کی تقرری سے رئیس کچھ خوش تو نہ ہوا تھا بلکہ کشیدہ خاطر تھا، لیکن میری والدہ صاحبہ نے رئیس سے ان کی بہت سفارش کی اور کہا کہ یہ آپ کے بڑے قدیمی ہیں اور ایسے ایسے ہیں۔ آپ کو ان پر بڑی نظر عنایت رکھنی چاہیے۔ غرض پنڈت جی نے ایسی مبارک گھڑی اور شُبھ لگن سے ریاست میں قدم رکھا

تھا کہ آج تک موجود ہیں اور اب وہی منتظمِ ریاست ہیں۔ خیر پنڈت صاحب کو آئے ہوئے چند ہی روز گزرے تھے۔

نواب محمد مختار حسین خاں کو اختیارات ہونا اور ان کا فوت ہونا:

اور نواب محمد مختار حسین خاں صاحب کو ریاست کے اختیارات ملے ہوئے کوئی تین مہینے ہوئے تھے کہ رئیس موصوف بیمار ہو کر دہلی آئے۔ مرض روزبروز شدت پکڑتا گیا۔ دہلی آئے ہوئے آٹھ دس روز گزرے تھے کہ ۱۳ مارچ ۱۸۷۸ء کو شب کے وقت نواب محمد مختار حسین خاں نے دنیا سے کوچ کیا۔ کیا کہوں اس واقعۂ جاں کاہ سے کس قدر قلق ہوا۔ ہائے میرے شفیق اور پیارے بھائی کا بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے بھی چوبیس برس کی عمر عالمِ شباب ہی میں قضا کی تھی۔ اس کو بھی جوانی میں موت آئی۔ ع

این ماتم سخت است، کہ گویند جواں مُرد

ان کو بھی روشن چراغ دہلی میں دفن کیا۔ خدا بہشتِ بریں نصیب کرے۔

نواب محمد مختار حسین خاں کی اولاد کا حال:

اس کے ایک دختر اور ایک فرزند نواب محمد ممتاز حسین خاں بہادر ہے جو اب سلامتی سے رئیس ہے اور اس کی عمر اس وقت اللہ رکھے ۱۳ سال کی ہے۔ خدا کے فضل سے لاہور چیف کالج (۱۰۷) میں تعلیم پاتا ہے (۱۰۸) خدا اس کو پروان چڑھائے اور عمرِ طبعی کو پہنچائے اور ریاست برتنی نصیب کرے اور سعادت مند ہو اور ہماری آنکھوں کو اس کے دیدار سے روشن رکھے۔ میرے بھتیجے کا فرزند میرا پوتا۔ موئی مٹی کی نشانی ہے۔ خدا کی شان ہے۔ ہوا ہمارے خاندان میں اب تو کوئی ایسا بزرگ سب کا سرپرست رہا ہی نہیں۔ بھائی اصغر علی خاں تھے ۱۸۷۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔ بھائی جعفر علی خاں تھے، وہ ۱۸۷۹ء میں رحلت کر گئے۔ اسی سال میں ہماری والدہ شادی

بیگم صاحبہ یعنی ہمارے والد کی بیاہتا بیوی تھیں ۔ وہ بھی فوت ہو گئیں ۔ ہر ایک کا جدا جدا قلق ہے ۔ اس غم کی تحریر سے دیکھو تو سینہ ہی شق ہے ۔ بیت:

کس کا افسانہ کہیں، کس کو بھلا یاد کریں
غمِ مجنوں کریں یا ماتمِ فرہاد کریں

پنڈت کشن لعل صاحب کا منتظمِ ریاست ہونا :

نواب محمد مختار حسین خاں کے انتقال کے بعد پنڈت کشن لعل صاحب نے شاید اپنی قدامت کی اسناد وغیرہ صاحب کمشنر بہادر کو ملاحظہ کرائیں ۔ اس پر صاحب بہادر نے پنڈت جی کو منتظم مقرر کر دیا۔ سو حقیقت میں پنڈت جی کی قدامت میں تو شک نہیں کیوں کہ ان کے والد اور یہ خود بھی میرے ابّا جان کی نوابی کے عہد میں ریاست کی طرف سے وکالت کی خدمت پر مقرر تھے ۔ اور یہ خیر خواہ اور نیک نام بھی رہے ۔ اور اپنی ذات سے لائق فائق بھی بہت کچھ ہیں ۔ مگر اب تو چند روز سے پنڈت صاحب نے ہم لوگوں سے ایسا برتاؤ شروع کیا ہے کہ قدیمی قدامت اور اگلی خیر خواہی کے برعکس نظر آتا ہے ۔

اوہو ۔ میں کیا کہتی تھی اور کیا کہنے لگی ۔ کہاں سے کہاں چلی گئی ۔ مجھے اپنی کہانی کہنی تھی یا اوروں کے قصے چھونے لگی ۔ مقصد سے دور جا پڑی۔ نہیں نہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو مقصد کے قریب ہی قریب ہوں۔

باب سوم

بیتی کہانی کا اِتمام

بیگمات کا اصغر علی خاں سے بگڑ کر دہلی آنا:

ہوا جب میرے بھائی نواب محمد تقی علی خاں صاحب کا انتقال ہوا اور محمد مختار حسین خاں مسند نشینِ ریاست ہوئے اور منجھلے بھائی محمد اصغر علی خاں صاحب منتظمِ ریاست ہوئے تو آپس میں جھگڑے فساد پڑے تھے۔ اور محلوں کی تمام بیگمات اصغر علی خاں صاحب منتظمِ ریاست سے بگڑ کر دہلی چلی آئی تھیں اور یہاں صاحب کمشنر بہادر کی پیشگاہ میں اپنے اپنے وثیقوں کے ملنے کے لیے استغاثہ کیا تھا۔ چنانچہ میں بھی اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ دہلی آئی تھی۔ مجھے آئے ہوئے آٹھ دس روز گزرے تھے۔

میری ساس کا بیمار ہونا اور میرا لودھیانہ جانا:

کہ لودھیانہ سے آدمی آیا۔ اور اس نے آن کر میری والدہ کو پیام دیا کہ آپ کی سمدھن نور محل صاحبہ بہت بیمار ہیں۔ آپ کو مناسب ہے کہ ان کی بہو شہر بانو بیگم کو لودھیانہ بھیج دیں۔ بس یہ سنتے ہی میری روانگی کی صلاح ٹھہر گئی۔ ریل تو ان دنوں میں تھی نہیں۔ چالیس روپیہ کو شکرم کرایہ کرکے دوسرے روز ہی لودھیانہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ مارا مار تیسرے روز لودھیانہ پہنچی۔ دیکھا تو حقیقت میں خوش دامن صاحبہ کا بُرا حال تھا۔ خیر جو کچھ بن پڑی، اُن کی خدمت کی۔ دو تین مہینے میں ان کو صحت ہوئی۔ مگر مجھ سے پھر وہی زکاوت، روکھا پن، ناک میں دم آ گیا۔ الٰہی کیا کروں۔ خاوند ہے تو اس کا عجب ڈھنگ ہے کہ کچھ پروا ہی نہیں۔ ساس ہے تو ان کا یہ رنگ ہے کہ گویا خون کی پیاسی ہیں۔

والدہ کا بیمار ہونا اور میرا طلب کرنا اور ساس کا نہ بھیجنا:

میں اسی مصیبت میں مبتلا تھی کہ دہلی سے والدہ صاحبہ کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ میں سخت بیمار ہوں، جلد آ جاؤ۔ کھانا وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو۔ خط دیکھ کر

جی بہت پریشان ہوا ۔ پر سوچا کہ کیا کروں ۔ کیوں کر جاؤں ۔ یہ مجھے کب جانے دیں گی ۔ آخر وہ خط میں انور محل صاحبہ کے پاس لے گئی ۔ انھوں نے پڑھ کر سنا اور اور پھر لا کر میری ساس کو سنایا۔ اور بہتیرا کچھ کہا سنا، ہرچند سمجھایا کہ " دیکھو بہو کو جانے دو ۔ اس کی ماں بیمار ہیں ۔ اس کا جانا ضرور ہے ۔" ادھر میری ددا اور استانی جی نے طرح طرح سے کہا مگر ان کے کان پر جوں بھی نہ چلی ۔ خیال بھی نہ کیا ۔ گویا سنا ہی نہیں ۔ میرا رنج کے مارے یہ حال ہوا کہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ۔ غیر لوگ دیکھ دیکھ کر ترس کھاتے اور کہتے کہ " ہے ہے کیسی ظلمن ساس ہے ایسی غریب بہو اور اس پر یہ ظلم ۔" لیکن اس خدا کی بندی نے آنکھ اٹھا کر بھی تو نہیں دیکھا کہ اس پر کیا بنی ہے؟ نہیں معلوم میری طرف سے انھیں کیا بغض تھا کہ انھوں نے میرے سامنے کبھی اپنی چتون کا بل نہیں کھولا ۔ میری شادی ہوئے پر وہ بارہ تیرہ برس زندہ رہیں ۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے مجھ سے کبھی کشادہ پیشانی ہو کر بات نہیں کی ۔ خیر اس عذاب میں چار مہینے اور گزرے۔

والدہ کا صحت پا کر لودھیانہ جانا اور مجھے ہمراہ لے کر دہلی آنا:

جب والدہ صاحبہ کو صحتِ کلّی حاصل ہوئی تو وہ خود لودھیانہ گئیں اور انھوں نے جا کر میری خوش دامن کی خوب خبر لی ۔ اچھی طرح جھاڑا۔ اس پر بھی بڑی جنگ و جدال سے والدہ مجھے لے کر دہلی آئیں ۔ یہاں آن کر میرے گلے کا گنڈا، جو مولوی مخصوص اللہ صاحب (۱۰۹) کے ہاتھ کا تھا، وہ بڑھایا ۔ اور بڑی خوشی کے چند روز کے بعد عشرت محل، میری سوتیلی ساس، لودھیانہ سے بیمار ہو کر دہلی آئیں اور یہاں علاج معالجہ بہتیرا کیا پر فائدہ نہ ہوا ۔ دو مہینے کے بعد انھوں نے انتقال کیا ۔ پھر تو سارا خاندان لودھیانہ سے دہلی آیا ۔ میری خوش دامن صاحبہ بھی تشریف لائیں ۔ کوئی دس بارہ روز رہ کر پھر لودھیانہ کی تیاری کی۔

میرا لودھیانہ جانا اور بال بچے کی امید کا ہونا:

اور میرے لے جانے کے واسطے بھی والدہ صاحب سے کہا۔ انھوں نے بہت سی شرطیں کر کے مجھے ان کے ساتھ بھیج دیا۔ لدھیانہ جا کر مجھے بال بچے کی امید ہوئی۔ دو مہینے کے بعد یکایک والدہ صاحب بھی لودھیانہ آئیں۔ میں ان کے آنے سے بہت خوش ہوئی۔ اور یہ سمجھی کہ شاید میرے پاس رہیں گی۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ وہ تو اپنی تنخواہ بدستور سابق مقرر ہو جانے کے لیے درخواست کرنے لاہور جاتی ہیں۔ سن کر نہایت رنج ہوا۔ وہ دوسرے روز لاہور کی طرف روانہ ہو گئیں۔ کوئی دو تین مہینے گزرے ہوں گے۔

میرے شوہر اور ساس کے درمیان تکرار کا ہونا:

کہ ایک دفعہ میرے شوہر اور ان کی والدہ کا آپس میں تکرار اور جھگڑا ہوا اور وہ لڑ جھگڑ کر اپنے چچا محمد یعقوب علی خاں صاحب مرحوم کے ہاں چلے گئے۔ اور وہیں رہنے سہنے لگے۔ میں اپنی ساس جی کے پاس رہی۔ مگر اب تو خوش دامن صاحبہ کا یہ حال ہوا کہ کمال ہی مہربانی سے پیش آنے لگیں اور طرح طرح کی خوشامد کرنے لگیں۔ [illegible] پر بھی تاکید ہوئی کہ دیکھو خبردار کوئی ایسی بات نہ کرنا جو مجھ کو ناگوار گزرے۔ ایسا نہ ہو یہ بھی خفا ہو کر اپنے خاوند کے پاس چلی جائے۔ بھلا میں [illegible] کی بدولت [illegible] دیکھ رہی ہوں۔ اگر یہ بھی یہاں نہ رہی تو پھر وہ کاہے [illegible] گا۔ میں [illegible] عورت [illegible] کبھی [illegible] جاؤں [illegible] سچ ہے [illegible] اور مطلب [illegible] رہی [illegible] ہوتی ہیں۔ [illegible] یہ کیفیت تھی [illegible] میرے شوہر [illegible] مضمون کا [illegible] اپنی والدہ سے [illegible] ہو کر اپنے چچا محمد [illegible] کے ہاں چلا گیا ہوں۔ [illegible] خوش دامن [illegible]

خط کے مضمون کو معلوم کرتے ہی اِدھر کو روانہ ہو جائیں اور یہاں آن کر ہمارا بندوبست کر جائیں ۔ وہاں سے تو انھوں نے خط لکھ کر روانہ کیا اور یہاں سے میری ساس نے بھی اسی باب میں ایک خط لکھا ۔ اس میں بھی یہی تحریر کیا تھا کہ تم جلدی یہاں آجاؤ ۔ غرض چوتھے روز والدہ صاحبہ لاہور سے لودھیانہ آ گئیں ۔ اوّل تو میرے شوہر کو بہت سمجھایا کہ اپنی والدہ سے سلوک کر لو ۔ جب انھوں نے نہ مانا تو مجھے بھی میرے شوہر کے پاس بھیج دیا۔

ساس سے علیحدہ ہونا اور شوہر کا صحبتِ بد میں مبتلا ہونا :

اب ہم علیحدہ مکان میں رہنے بسنے لگے ۔ مگر قسمت کی خوبی دیکھیے کہ اِدھر تو میاں جو آزاد ہو گئے تو بُری صحبت میں جا کر بیٹھنے لگے اور روز بروز ان کی عادتیں بگڑنے لگیں ۔ ان کے ڈھنگ دیکھ دیکھ کر جلتی ۔ اُدھر والدہ صاحبہ کو جو دیکھتی ہوں تو وہ بھی کچھ بے رخ نظر آتی ہیں ۔ نہ وہ اگلی سی محبت نہ وہ دل جوئی ۔ چونکہ مجھے بھی والدہ صاحبہ کے ساتھ کمال درجہ کا اُنس تھا، اس لیے میں نے کچھ زیادہ خیال نہ کیا ۔ بلکہ یہ جانا کہ میرے شوہر نے میرے ساتھ جو بے اعتنائی شروع کی ہے تو شاید اِس وجہ سے یہ دل برداشتہ ہیں ۔ کوئی بیس (۲۰) روز میرے ہاں رہی ہوں گی ۔ پھر وہ تو لاہور چلی گئیں۔ کوئی دو تین مہینے کے بعد میرے ہاں بال بچے پیدا ہونے کا وقت آیا۔

خوش دامن کا مجھے اپنے گھر لے جانا اور دخترِ اوّل کا میرے ہاں پیدا ہونا:

تو میری ساس کو بھی خبر ہوئی ۔ وہ جھٹ ڈولی منگا، میرے مکان پر آئیں اور بہت منت سماجت کر کے مجھے شوہر سمیت اپنے مکان پر لے گئیں ۔ میں تو ان سے کچھ روٹھی ہی نہیں تھی، البتہ اُن کے بیٹے اُن سے خفا تھے ۔ خیر وہاں جا کر اُسی روز

جمادی الاول کی پانچویں تاریخ ۱۲۸۱ھ (۱۱۰) کو میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ اسی وقت والدہ کو تار دیا گیا۔ کیوں کہ وہ لاہور میں تھیں۔ تیسرے روز لاہور سے وہ تشریف لائیں۔ ساتویں روز عقیقہ ہوا۔ اور صدیقہ بیگم نام رکھا۔ چھٹی کی رسم بھی اچھی طرح ادا ہوئی۔ میری ساس کا تو اس روز یہ حال تھا کہ مارے خوشی کے زہرہ پھٹا جاتا تھا۔

والدہ کا چھٹی نہ دینا اور میرا رنجیدہ ہونا:

مگر مجھ کو اس روز بڑا رنج تھا۔ اس لیے کہ میں اس گمان میں تھی کہ اماں جان ضرور چھٹی دیں گی۔ کیونکہ دستور کی بات ہے۔ نواسا نواسی پیدا ہونے سے پہلے روز ننھیال سے بھاری مصالحہ کے کرتے، ٹوپیاں، جھنگلی، کڑے، پنگوڑا، پلنگڑی [illegible] بچی کی نہالچی، پوتڑے، تمام کنبے کے جوڑے، چھڑی، مسکینوں کے لیے نقد روپیہ سب سامان کر کے لاہور سے لائی ہوں گی۔ یا ہزار بارہ سو روپیہ نقد چھٹی کے [illegible] دے دیں گی۔ پر انھوں نے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دی۔ اگرچہ ان دنوں میں پانچ [illegible] ہزار کا اثاثہ ان کے پاس تھا اور کچھ تنگ دست [illegible]۔ [illegible] سے علاوہ ان [illegible] کا خرچ میرے وثیقے میں سے ہوتا تھا۔ کیوں کہ جب تک وہ پاٹودی نہیں [illegible] اپنا زرِ وثیقہ ساٹھ روپیہ ماہوار برابر ان کو دیتی رہی۔ لیکن انھوں نے اپنے [illegible] اپنی آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی۔ اور میرا سمدھانے کا کچھ خیال نہ کیا۔ پس مجھ [illegible] خاوند سے بڑی شرمندگی ہوئی۔ کیوں کہ تمام عمر کا یہ طعنہ ان کا مجھ پر [illegible] میں نے والدہ صاحبہ سے کسی طرح کی شکایت نہیں کی۔ خاموش [illegible] روز کے بعد وہ لاہور چلی گئیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد میری [illegible] پڑیں۔ کھانسی بخار شروع ہوا۔ طبیب نے مسہل دی۔ [illegible] فائدہ [illegible] بگڑتی ہی چلی گئی۔ صدیقہ [illegible] تو ان کا بہت ہی برا حال ہو [illegible] کو خط لکھا۔ وہ پانچویں روز لاہور سے لودھیانہ آئیں۔

خوش دامن صاحبہ کا انتقال کرنا:

جب ان کی حالت بہت ردی ہوئی تو دمِ واپسیں سے دو گھنٹے پہلے میری ساس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور سامنے بٹھا کر مجھ سے کہا کہ میں نے تیرے ساتھ بہت سختیاں کی ہیں۔ اب للہ میرا قصور معاف کر دے۔ یہ کہ کر لگیں ہاتھ جوڑنے اور منت کرنے۔ اس وقت تو میرا بھی دل بھر آیا۔ اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ کیونکہ مجھے خدا کا خوف آ گیا۔ اس وقت میں نے ان سے کہا کہ حضرت میں نے معاف کیا۔ ۳۱ شوال ۱۲۸۱ھ (۱۱۱) تھی کہ شب کو اِس جہاں سے انھوں نے رحلت کی۔ اللہ تعالی ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ وہ بہت اچھی آدمی تھیں اور جو کچھ سختیاں انھوں نے میرے ساتھ کیں، یہ میری قسمت کی خوبی تھی۔ بیت:

بُرا ہے یا بھلا ہے جو ہے دنیا میں غنیمت ہے
کہ پیدا ہائے پھر انسان مر کر ہو نہیں سکتا

اب تقدیر کی اور خوبی سنو۔ کہ جب میری ساس کا انتقال ہوا، تو انور محل صاحبہ یعنی میری سوتیلی ساس نے صندوقوں اور کوٹھریوں کی کنجیاں میرے خاوند کے حوالے کر دیں۔

خاوند کی آوارگی اور مال کا لٹانا:

اب میاں کا خال سنو۔ کہ وہ صحبتِ بد میں مبتلا ہو کر عجیب ہواؤں میں بھرے ہوئے تو تھے ہی، ماں کی مال و متاع پر جو دست رس ہوا تو پھر کیا ٹھکانہ تھا۔ گھر میں آتے ہیں تو چتون ہی بدلی ہوئی ہے۔ تیور ہی کچھ اور ہیں۔ یہ کوٹھری کھولی، جو جی چاہا نکال لے گئے۔ نہ کسی سے صلاح نہ مشورہ۔ نہ پوچھنا نہ گچھنا۔ چار پانچ ملکنوں، گھر کے نمک حرام چیلوں اور باہر کے بدمعاشوں نے ایک سنگت بنا ان کو ورغلا لیا۔ اور خوشامد کی باتیں بنا کر دمبازیوں پر چڑھا لیا۔ اب یہ صورت ہو گئی کہ آج پانسو

روپیہ کی مرغی خرید لی اور کل دو سو روپیہ کا تیتر لے لیا۔ اسی طرح مرغبازی اور تیتر بازی کے نقشے جم گئے۔ اور لگی دولت اُڑنے۔ گویا مال مفت دلِ بے رحم تھا۔ روپیہ زیور نذر چٹر کر دیا۔ تیس بتیس ہزار روپیہ کا تو زیور میری ہی ذات کا تھا اور پچاس پچپن ہزار روپیہ کا اثاثہ اپنی ذات کا میری ساس چھوڑ کر مری تھیں۔ قریب اسی نوے ہزار روپیہ کے سب زیور سامان وغیرہ ہو گا۔ وہ یوں ٹھکانے لگنے لگا۔ بہتیرا خود سمجھایا۔ اوروں سے کہلوایا۔ مگر وہ کب سنتے تھے۔ آخر سب نے مل کر صلاح ٹھہرائی کہ نرمی سے کام نہیں چلتا۔ اب زبردستی ان سے یہ مال و اسباب اپنے حق میں لینا چاہیے۔ جب یہ صلاح ٹھہر گئی۔

مرزا ایوب بیگ سے صلاح لینا:

[illegible]

گیا۔ میاں کے سارے نشے ہرن ہو جاویں گے اور قلعی کی طرح اڑ جائیں گے۔ اس وقت کوئی مونس و ہمدم نہ سوجھے گا۔ بس پھر یہی میاں بیوی ہوں گے اور یہی بیوی اور یہی گھر۔ ان دونوں صورتوں میں سے جو نسے پر تمھارا دل ٹھکے، وہ اختیار کر لو۔

بس بوا، جب میں نے مرزا ایوب بیگ کی اس تقریر پر بخوبی غور کیا تو میرے خیال میں یہی آیا کہ روپیہ پیسہ آنی جانی چیز ہے۔ اگر میری تقدیر سیدھی ہوتی تو جھجّر کی ریاست کیوں بگڑتی۔ زر و زیور کے واسطے خاوند کو چھوڑنا عین حماقت اور نادانی ہے۔ اگرچہ کسی نے میرے اِس خیال کو پسند کیا اور کسی نے ناپسند۔ اوّل اوّل تو والدہ صاحبہ بھی کچھ بھر بھر کرتی رہیں، پر میں تو اس رائے پر ایسی جمی کہ بہتیرا لوگوں نے ورغلایا، میں نے کسی کی نہ سنی۔ آخر اماں جان نے جب مجھے خوب مستحکم پایا تو وہ بھی میری ہی طرف ہو گئیں جب میری ساس کا چالیسواں ہو چکا تو بندی اپنی لڑکی کو لے والدہ صاحبہ کے ہمراہ دلی چلی آئی۔ آخر کار وہی ہوا جو مرزا ایوب بیگ نے کہا تھا۔ کوئی پانچ مہینے گزرے ہوں گے جو سنا کہ جتنا زیور، کپڑا مال و متاع تھا وہ سب میاں اُڑا بیٹھے اور الف کر دیا۔ بلکہ اس پر طُرّہ یہ ہوا کہ بہت سا قرضہ بھی کر لیا اور نوبت فاقہ کشی کی آن پہنچی۔ اور جتنے جوان مرگ ان کو گھیرے ہوئے تھے وہ سب فِفرّو ہو گئے۔ اب میاں اپنا سا منہ لے کر اکیلے رہ گئے۔ یہ سن کر جی تو بہت جلا، گو پہلے یقین نہ آیا کہ اتنی دولت ایسے تھوڑے دنوں میں کیوں کر اُٹھادی ہو گی۔ مگر جب ان کے اِصراف پر خیال کیا تو جانا کہ ان کی فضول خرچی کے آگے تو اگر قارون کا خزانہ بھی ہوتا تو کیا مال تھا۔ یقین ہوا کہ بے شک وہ سب کچھ تباہ کر کے فارغ ہو بیٹھے ہوں گے۔ بس یہ سُنتے ہوئے چند ہی روز گزرے ہوں گے۔

میرے شوہر کا خط والدہ کے نام آنا:

کہ کئی مہینوں کے بعد ایک دن شوہر صاحب کا ایک خط میری والدہ کے نام آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ۔ جناب میری اہلیہ کو جو آپ اپنے ہمراہ دلی لے گئی تھیں

۔اب عرصہ پانچ مہینے کا گزر گیا اور نورچشمی صدیقہ بیگم کو دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے ۔ اِس واسطے ملتمس ہوں کہ اگر آپ مہربانی فرما کر میری اہلِ خانہ کو معہ نور چشمی صدیقہ بیگم کے اس طرف کو روانہ فرمادیں ۔" بس جب یہ خط آیا تو اب کامل یقین ہو گیا کہ جو کچھ لوگوں سے سُنا تھا وہ صحیح ہے۔

والدہ صاحبہ کا جواب لکھنا :

اس کا جواب والدہ صاحبہ نے اُنھیں یہ لکھا کہ " برخوردارِ من ، خط تمھارا اپنی اہلِ خانہ و دختر کی طلب میں پہنچا ۔ میں تم سے یہ دریافت کرتی ہوں کہ تمھارے پاس تو اتنا کچھ مال و متاع تھا کہ ایک بیوی کیا ، چار نکاح کر سکتے تھے۔ اور جب تم نکاح کر لیتے تو ایک دختر کیا ، بہتیری اولاد پیدا ہو جاتی ۔ مگر افسوس ہے ۔ جب تمھارے پاس روپیہ تھا تو اُس وقت جورو بچوں کے گھر سے نکل جانے کا خیال کبھی نہ کیا اور مہینوں بے فکر اور بے خبر بیٹھے رہے ۔ اب جو لاکھ کا گھر خاک کر چلے اور مفلس قلاش ہو کر بیٹھے تو جورو بچے یاد آئے ۔ کس مُنہ سے بلاتے ہو ۔ وہ وقت یاد کرو کہ بات بھی نہ پوچھتے تھے اور اتنی مدت یہ بھی نہ جانا کہ جورو بچے کہاں پڑے سڑتے ہیں ۔ بارے اب تم کو ہوش آیا تو بڑی جلدی آیا۔"

بس بوا ، جس وقت یہ پتھر سے بھی سخت جواب اُن کو پہنچا تو میاں کی سٹی بھول ۔لگے تیری میری خوشامد کرنے ۔ آخر حکیم آغا علی خاں کے سامنے ہاتھ جوڑے اور اُنھیں منتیں کرکے میرے لینے کے واسطے دلی بھیجا۔

حکیم آغا علی خاں کا میرے لینے کو دلی آنا اور میرا لودھیانہ جانا اور گھر کی تباہی کا دیکھنا:

حکیم آغا علی خاں دلی آئے ۔ اور میاں کی طرف سے میرے لے جانے کا پیام لائے۔ اماں جان کے رُوبرو بہت ہاتھ جوڑے اور پاؤں پڑے ۔ نہایت اصرار و

تکرار کے بعد اماں جان نے میرا بھیجنا منظور کیا ۔ آٹھ دس روز سامان سفر میں گزرے۔

میرا لودھیانہ جانا اور گھر کو دیکھ کر پچھتانا :

جب تیاری ہو گئی تو ۲۴ نومبر ۱۸۶۵ء کو میں سواری شکرم میں معہ اپنی دختر کے لودھیانہ کو روانہ ہوئی ۔ حکیم صاحب بھی میرے ساتھ گئے ۔ تیسرے روز قریب نو بجے شب کو لودھیانہ پہنچے ۔ گھر میں جا کر اترے ۔ گھر کو جو دیکھتی ہوں تو عجب حال ہے جیسے کوئی لوٹ کر لے گیا ۔ مکان کے صحن میں کیا دیکھتی ہوں کہ گھوڑے گھوڑے بندھے ہوئے ہیں ۔ ہر طرف کوڑے کرکٹ کے اُنبار لگے ہوئے ہیں ۔ لڑکی دیکھ کر ہکا بکا ہو گئی ۔ کیوں کہ وہ دلّی کے عمدہ مکان میں رہ کر گئی تھی ۔ وہاں دیکھا تو ایک ڈھنڈار مکان دیکھا ۔ خیر گھوڑے تو اُسی وقت کھلوا کر باہر اصطبل میں بھیجے۔ دالان میں جو گھُسی تو دیکھتی کیا ہوں ، کوٹھری کے آگے ایک پلنگ بچھا ہے اور اس پر ایک میلی کچیلی مٹّی کے رنگ کی چادر کسی ہوئی ہے ۔ جس کے دیکھنے سے گھن آتی تھی۔ اس کے آگے ایک تخت بچھا ہے ۔ اس پر ایک میلا چیکٹ دسترخوان کا چیتھڑا پڑا ہے ۔ اُس میں دو تین روٹیاں بیسنی خشک لپٹی دھری ہیں ۔ میں نے جانا کسی ماما اصیل کی روٹی رکھی ہے ۔ اور ایک کونے میں فتیل سوز رکھا ہے ۔ اس پر ریوڑی والے کی دکان کا سا چراغ دھرا ٹمر ٹمر جل رہا ہے ۔ اب اِدھر دیکھتی ہوں اُدھر دیکھتی ہوں ۔ فرش کا کہیں پتہ نہیں ۔ الٰہی بیٹھوں تو کہاں بیٹھوں ۔ آخر جل کر میں نے کہا ۔ یہ تخت پر کس کا چیتھڑا پڑا ہے ، اسے تو اٹھاؤ ۔ ماما نے جواب دیا کہ " بیوی یہ تو سلامتی سے میاں کا کھانا دھرا ہے ۔ خدا رکھے ابھی کھانا کھانے بیٹھے تھے کہ اتنے میں آپ کی سواری آ گئی " یہ سن کر تو اور بھی کلیجہ بُھلسا ۔ میاں کی طرف جو دیکھا تو وہ مارے ندامت کے عرق عرق ہو گئے ۔ شرمندگی سے آنکھیں نیچی کر لیں ۔ میں نے ماما سے کہا کہ " کچھ آٹا گھی نکال کر روٹی ڈالی پکا کر ساتھ کے آدمیوں کو دی جائے ۔ " ماما بولیں " بیوی آٹا ، گھی ، اناج ، پات تو گھر میں نہیں تم ہے ۔ " خیر ناشتا جو اماں نے ساتھ کر دیا تھا وہ منگایا۔

دیکھا تو بچے ہوئے صرف دو پراٹھے اور پانچ چھ پوریاں اور کچھ کباب نکلے۔ اس میں کیا کسی کو دیتی۔ میں نے روپیہ نکال کر کالے خدمت گار کو دیا اور اس سے کہا کہ "بازار سے کچھ کچوریاں، پوریاں اور کچھ مٹھائی لے آ۔" وہ جا کر لے آیا۔ پہلے ساتھ والوں کو دیا، پھر آپ کھایا، میاں کو کھلایا۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر سر منہ لپیٹ کر پڑ رہی۔

صبح کو اُٹھ کر کوٹھری کھولی۔ دیکھا جن صندوقوں میں دو دو قفل لگے رہتے تھے وہ پہاڑ کی طرح کھلے پڑے ہیں۔ ان میں پھٹے پرانے گدڑے چیتھڑے پڑے ہیں، کسی میں گھوڑے [illegible]۔ باقی جو ہیں ان میں چوہے قلابازیاں کر رہے ہیں۔ دیکھ کر [illegible] پانچ چھ مہینے میں [illegible] کا گھر خالی کر [illegible] منہ میں [illegible] خوب [illegible] گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے [illegible] منہ میں زبان کہاں تھی کہ جو جواب دیتے۔ آخر صبر کر کے چپ ہو رہی۔ اتنے میں [illegible] نے آن کر پوچھا کہ "بیوی! کھانے پکانے کے واسطے کیا حکم ہے، کیا بندوبست ہو گا؟" میں نے اُس سے کہا کہ "گھر والے سامنے بیٹھے ہیں، ان سے پوچھو۔" انھوں نے سن کر کیا کیا کہ اُٹھ کر جا اپنا صندوقچہ لا میرے آگے رکھ دیا۔ صندوقچی میں جو دیکھتی ہوں کہ ایک انگوٹھی اور دو چھلّے طلائی اور دو روپیہ نقد پڑے ہیں۔ دیکھ کر آگ سی تو لگ گئی۔ جی تو چاہا کہ مُنہ نوچ لوں۔ مگر کیا کرتی، غُصّہ پی لیا اور صبر کیا۔ یہ تو میری کی پونجی رہ گئی اور خرچ پر نظر کرو تو دو تین روپیہ روز کا تو گھوڑوں کا خرچ تھا۔ گھر کا علیحدہ رہا۔ آخر جل بھن کر میں نے کالے خدمت گار کو بلوایا اور تیس روپیہ اپنی صندوقچی میں سے نکال کر اُس کو دیے تو تمام سودا سلف، اناج، پت منگایا۔ گھر رہنے سہنے لگی۔

قرضے کا زیادہ ہونا :

مگر حال یہ ہوا کہ قرض دوام پر خرچ روزمرہ کا مدار آن ٹھہرا۔ اس سے [illegible]

پہلے تو یہ تھا کہ پچھتّر روپیہ ماہوار تو میری ساس کا وثیقہ تھا اور سو روپیہ میاں کے (۱۱۲)
ایک سو پچھتّر روپیہ ماہوار کی آمدنی تھی اور پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار کی زیادہ ضرورت
ہوتی تھی ۔ تو وہ کچھ پرانا دھرانہ گوٹہ کناری یا کوئی ٹوٹی پھوٹی زائد رقم بیچ ڈالی۔ چار سو
پانسو کا بندوبست کر لیا، سال بھر گزر گیا ۔ اب نہ خوش دامن رہیں نہ ان کا وثیقہ رہا ۔
اور نہ میاں نے گھر میں کچھ اثاثہ چھوڑا ۔ خرچ جو کچھ پہلے تھا وہ وہی کا وہی موجود رہا ۔
آمدنی کم یعنی صرف سو روپیہ میاں کی رہ گئی ۔ ہر مہینہ تیس چالیس روپیہ کی رقم قرض
کی بڑھنے لگی ۔ حیران پریشان تھی کہ الٰہی کیا کروں ۔ اِس گھر کا کیوں کر ٹھکانا لگے گا۔ نہ
تو آمدنی بڑھنے کی کوئی شکل ہوتی ہے اور نہ میاں خرچ کم کرنے دیتے ہیں۔

دوسری لڑکی کا پیدا ہونا اور اس کا فوت ہونا:

انھی دنوں میں میرے ہاں دوسری لڑکی پیدا ہوئی ۔ اور چالیس دن کے بعد
چلّا نہا کر میں تو والدہ کے ہاں دلی چلی آئی اور میاں وہیں رہے ۔ اور بھی قرضہ کر لیا ۔
میں کوئی دو تین مہینے رہ کر پھر لودھیانہ کو واپس آ گئی۔ یہاں آئے کوئی دو تین مہینے
گزرے ہوں گے کہ گود کی لڑکی کو ایسا جان ہار بُخار چڑھا کہ جان ہی لے کر ٹلا ۔ پلی
پلائی پڑا سی لڑکی چار دن کے بخار میں چٹ پٹ ہو گئی ۔ میں کلیجہ تھام رہ گئی۔ میرے
کلیجہ پر اولاد کا یہ پہلا داغ تھا ۔ لیکن خدا کی مرضی میں کیا چارہ تھا ۔ صبر کیا ، پر طبیعت
کا یہ حال کہ دم بدم بگڑی جائے ۔ اور کلیجہ مُنہ کو آئے ۔ کسی سے بولنے بات کرنے
کو جی نہ چاہے۔ آخر بڑی لڑکی کو ساتھ لیے پھر دلی چلی آئی۔ کوئی تین چار مہینے والدہ
صاحبہ کے ہاں رہی اور پھر لودھیانہ کو واپس چلی گئی۔ رہی سہی کچھ مدت کے بعد پھر
بال بچے کی مجھے امید ہوئی۔ میں نے والدہ صاحبہ کو اطلاع دی۔ اب کے انھوں نے
کسی دلی کے پیرزادے سے ایک گنڈا بنوا کر مجھے بھیجا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجا
کہ نواں مہینہ شروع ہو تو دلی چلی آنا۔

میرا دہلی آنا اور لڑکی کا پیدا ہو کر دونوں کا فوت ہونا:

جب مجھے پورے دن شروع ہوئے تو میں دہلی چلی آئی۔ کوئی دس روز کے بعد بڑی لڑکی کے گلے پر ایک دانہ نمودار ہوا۔ وہ دانہ کیا تھا گویا اجل کا پیغام تھا۔ کیا کہوں اس دانہ کی سوزش سے لڑکی ایسی تڑپتی تھی جیسے بِن پانی کی مچھلی۔ بہتیرا علاج کیا پر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آٹھویں روز دنیا سے کوچ کر گئی۔ ہنوز وہ غم نہ مٹا تھا کہ پانچویں روز ایک اور لڑکی پیدا ہوئی وہ بھی پانچ ہی روز دنیا کی ہوا کھا کر عقبیٰ کو سدھاری۔ اب تو غم کا پُتلا بن گئی۔ اکیلی تنہا رہ گئی۔ عجب طرح کا حال ہوا، جینا وبال ہوا۔ دہلی سے بھی جی گھبرایا، پھر لودھیانہ کا رستہ لیا۔

والدہ کا میرے ہمراہ لودھیانہ جانا اور بدمزاجی کر کے دہلی آنا:

اب کے والدہ صاحبہ بھی میرے ساتھ لودھیانہ تشریف لے گئیں۔ پانچ چھے مہینے رہیں، مگر ایسی بدمزاجیاں کیں کہ نفس تنگ کر دیا۔ اور ایک روز تو ایسی بگڑیں کہ کہنے لگیں میں تو ابھی دہلی جاؤں گی۔ مجھے اِسی وقت سوار کرادو میں دم بھر نہیں ٹھہرتی۔ خیر قہرِ درویش برجان درویش۔ میں نگوڑی بذات خود ان کو پہنچانے دہلی آئی۔ یہاں آن کر تو انھوں نے میرا ایسا پیچھا لیا کہ دم ضیق میں کر دیا۔

میرا لودھیانہ واپس جانا اور والدہ کا پاٹودی جانا:

آخر تنگ ہو کر میں بیس پچیس ہی روز میں لودھیانہ کو چلی گئی۔ اب تو یہ ایسی بگڑیں کہ خط کتابت تک بھی موقوف کر دی۔ لیکن میں ان کی خدمت گزاری برابر اسی طرح کرتی رہی۔ یعنی ساٹھ روپیہ ماہوار جو میرا زرِ وثیقہ تھا، وہ ان کو دیتی رہی۔ پھر انھوں نے اپنے پاٹودی جانے کی تدبیر کر لی۔ شاید کوئی پانچ مہینے کے بعد وہ پاٹودی تشریف لے گئیں۔ کیونکہ میں دلی سے آخر فروری ۱۸۹۹ء کو لودھیانہ چلی گئی تھی۔ اور

والدہ صاحبہ نے ۱۱ اگست ۱۸۶۹ء کو محکمہ (کذا) کمشنری دہلی میں اپنے زرِ وثیقہ کی درخواست کی تھی ۔ تو وہ شاید اسی مہینے میں یا ستمبر میں پاٹودی تشریف لے گئیں ۔ جب وہ وہاں پہنچ کر خاطر جمع سے بیٹھیں،

والدہ صاحبہ کا مجھ سے روپیہ طلب کرنا:

تو چند روز کے بعد انھوں نے ایک ماما کو لودھیانہ میرے پاس بھیجا ۔ اور وہ یہ پیام لائی کہ تمھاری والدہ نے کہا ہے " میرے ذمے تین سو روپیہ کا قرضہ دہلی کا رہ گیا ہے ۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی ادا کا تم بندوبست کر دو ۔" میں نے ماما کو جواب دیا کہ " بوا ! اس وقت تو مجھ سے روپیہ کا کچھ بندوبست نہیں ہو سکتا ۔ کیوں کہ میرے گھر میں آپ بے بندوبستی ہو رہی ہے ۔ اور میرا اپنا بال بال قرضے میں گتھا ہوا ہے ۔ مثل مشہور ہے کہ " پیر آپ ہی درماندہ ہے ، شفاعت کس کی کرائے " ۔ فی الحال تو قرض خواہوں کو دلاسا دے کر وعدہ وعید سے روکے ہیں ، تھامیں ۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ کچھ تدبیر ہو جائے گی ۔" ماما یہ جواب لے کر واپس گئی ۔ والدہ صاحبہ نے اس کے بعد مجھ سے خط کتابت بند ہی رکھی ۔ خیر میں بھی خاموش ہو رہی ۔ کیوں کہ میں اپنی مصیبت میں مبتلا تھی ۔ قرض خواہوں کا ہجوم تھا ۔ اور خرچ کی تنگی ۔ اس لیے کہ گھر لٹا لٹو کر جو میاں نے دھڑیوں قرضہ اپنے اوپر تھوپ لیا تھا ، ساری آمدنی اس کی قسطوں میں لگی ہوئی تھی ۔ اور پھر جو نیا قرضہ ہوا اس کی ادائیگی کی کوئی سبیل نہ تھی ۔ اس واسطے نہایت درجے کی ابتری پڑی ہوئی تھی ۔ جب میری اپنی یہ صورت تھی تو اس حال میں اُن کو میں اتنا روپیہ نقد بھیج کر کس طرح مناتی ۔ اور ایک مشت تین سو روپیہ کی رقم کہاں سے لاتی ۔ خیر اب میری یہ صورت ہوئی کہ سوچتی ہوں الٰہی کیا کروں ۔ ان قرض خواہوں کے تقاضوں کا کیا تدارک ہو ۔

مرزا ایّوب بیگ سے مشورہ کرنا اور اُن کا گھوڑے خرید کر لانا:

آخر میں نے مرزا ایّوب بیگ کو بلا کر اُن سے کہا کہ مرزا جی کوئی صلاح بتاؤ یا کچھ تدبیر کرو۔ میاں کو تو کچھ پروا نہیں۔ اور میں قرض خواہوں کے بلوے سے سخت حیران ہوں۔ زیست سے تنگ ہوں۔ مرزا جی نے میری تشفّی کی اور کہا کہ خاطر جمع رکھو، اللہ تعالیٰ مددگار ہے۔ ایک تدبیر کرتا ہوں۔ مرزا جی مجھ سے یہ کہہ کر چلے گئے اور بطور خود کہیں سے چار سو روپیہ قرض لے آئے۔ دوسرے ہی دن وہ روپیہ سے امرتسر کو روانہ ہوئے۔ وہاں سال کے سال گھوڑوں کا میلہ ہوا کرتا ہے۔ اُن دنوں میں بھی وہاں میلہ تھا۔ پانچ چھے روز کے بعد امرتسر سے دو گھوڑے بہت عمدہ خرید کر لائے ادھر تو گھوڑوں کو پالنا شروع کیا، انھیں خوب کھلایا پلایا، موٹا تازہ کیا، ادھر ادھر قرض خواہوں کو بھی دل دہی کرتے رہے۔ کہ دیکھو اب خدا چاہے تو ہمارے گھوڑے تیار ہو جاتے ہیں تو کیسی قیمت پاتے ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ تمھی لوگوں کے لیے یہ کھڑاگ کیا ہے۔ اب کچھ دیر نہیں خاطر جمع رکھو۔ تم دیکھو گے کہ کتنی جلدی تمھارے روپوں کی سبیل ہو جاتی ہے۔ اور ذرا میاں صاحب کو بھی کچھ نشیب و فراز سمجھاتے رہے۔ دو تین مہینے میں ان گھوڑوں کو تیار کر مرزا جی پٹیالہ لے گئے۔

مرزا ایّوب بیگ کا گھوڑے بیچ کر روپیہ لانا اور قرض خواہوں کو دینا:

اور چند ہی روز میں وہاں ان گھوڑوں کو دو ہزار روپیہ کو فروخت کر واپس آ گئے۔ یہاں آن کر انھوں نے وہ دو ہزار روپیہ میرے آگے رکھ دیے کہ لو بیگم صاحب تم قرض خواہوں کو دے کر کچھ سبک دوش ہو جاؤ۔ میں نے اسی وقت وہ دو ہزار روپیہ لیے ریوڑیوں کی طرح سے قرض خواہوں کو بانٹ دیے جب انھوں نے [illegible] لیا اور [illegible]

[illegible]

مجھے بال بچے کی امید ہوئی ۔ اس وقت یہ صلاح ٹھہری کہ اب کے پاٹودی میں جا کر بھائی محمد صادق علی خاں صاحب کے مکان پر یہ چلّہ تمام کروں۔

میرا پاٹودی جانا اور لڑکا پیدا ہو کر اس کا فوت ہونا:

یہ سوچ کر لودھیانہ سے پاٹودی کی طرف روانہ ہوئی ۔ اور میں وہاں سے دلی تک ریل میں آئی کیونکہ لودھیانہ سے دلی تک ریل جاری ہو گئی تھی ۔ پھر دلی سے ایک رتھ اور ایک ڈولی کرایہ کرکے پاٹودی پہنچی ۔ وہاں بھائی محمد صادق علی خاں کے مکان پر اُتری ۔ والدہ صاحبہ کو بھی خبر پہنچی ، وہ بھی شب کو بھائی صاحب کے مکان پر آئیں اور بہت سی منّتیں کرکے مجھے اپنے گھر لے گئیں ۔ کوئی آٹھ روز کے بعد میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ سب کو خوشی ہوئی ۔ والدہ صاحبہ نے سارے کنبے کو جمع کیا اور سب کی دعوت کی ۔ سوا مہینے کا چِلّہ نہا کر وہاں سے رخصت ہو لودھیانہ کو آئی ۔ ایک مہینہ وہ لڑکا زندہ رہا ۔ بعد ایک مہینہ کے وہ بھی اُجڑ گیا۔ میں کلیجہ پکڑ کر رہ گئی ۔ اور اب بالکل مایوس ہو گئی کہ میری کوئی اولاد زندہ نہیں رہے گی ۔ اِسی طرح پیدا ہوتی جائے گی اور مرتی جائے گی ۔ کیونکہ یہ چوتھا داغ تھا ، جو میرے کلیجے پر لگا۔

احمد علی خاں کا پیدا ہونا:

چند روز کے بعد پھر مجھے امید ہوئی۔اگرچہ اب کی دفعہ والدہ صاحبہ سے خط کتابت جاری تھی ، پر وہ بال بچہ ہونے تک میرے پاس نہیں آئیں۔ یہاں تک کہ ۲۸ رجب ۱۲۸۸ھ (۱۱۳) کو میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام احمد علی خاں رکھا۔ اس کے پیدا ہونے کی خوشی ہوئی ۔ پر ساتھ ہی یہ رنج بھی تھا کہ یہ کاہے کو جیے گا ۔ غرض کچھ خوشی کچھ رنج ، اِسی شش و پنج میں تھی کہ بیمار پڑی ۔ ایک مہینہ بعد کچھ صحت ہوئی تھی کہ رمضان شریف آ گئے۔

خاوند کا بیمار ہونا اور خانہ ویرانی کا ہونا:

رمضان شریف کی ۱۴ تاریخ تھی کہ میاں شکار کو گئے ۔ اچھی طرح تندرست دوسرے روز دن پندرہ کو نہائے ۔ روزہ کھول رات کو برف کھائے ۔ برف کا کھانا تھا کہ دردِ سر شروع ہوا ۔ وہ درد کیا تھا کہ قضا کا پیغام تھا ۔ شدت کا بخار چڑھا ۔ بس دوسرے ہی روز سرسام ہو گیا ۔ حکیم طبیب جمع ہوئے ۔ سینکڑوں علاج کیے ۔ تدبیروں پر تدبیریں پلٹیں ، دواؤں پر دوائیں بدلیں ، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا ۔ جو جو دوا کی مرض کی بگڑتی ہی چلی گئی ۔ ۲۱ تاریخ رمضان کی تھی کہ میں بیوہ ہو گئی۔ میرا گھر برباد ہو گیا ۔ میری خانماں کی تباہی ہو گئی ۔ میرے گھر کا مالک میرے سر کا تاج ، میرا افسر ، میرا شوہر ، اپنی بستی ، اپنی نگری کو چھوڑ کر یکایک دنیا سے کوچ کر گیا۔ ہائے ہائے وہ دن میرے واسطے قیامت کا دن تھا ۔ وہ گھڑی میری زندگی کی تباہی کی گھڑی تھی ۔ کیا کہوں ، کیا گزری ۔ سارے صدموں کو بھول گئی ۔ سب داغ ہرے ہو گئے۔ آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی اور دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹا ہوا تھا ۔ دیوانہ وار ایک ایک منہ تکتی تھی اور جی میں کہتی تھی کہ الٰہی کیا تھا اور کیا ہو گیا ۔ دو گھڑی کے بعد ایک آہ کا نعرہ دل سے اٹھا اور غش کھا کر زمین پر گری ۔ کچھ دیر کے بعد ہوش آیا تو کہتی تھی کہ کیا کروں ، کدھر نکل جاؤں ۔ کس سے فریاد کروں ۔ ہے ہے جوانی کی موت اور جوان بھی شیر کا شیر ۔ جس کی چوبیس برس کی عمر ۔ دنیا میں کیا رہا ، کیا جیا۔ اور کیا دیکھا ۔ ایک تو یہ غم والم تھا ، دوسرے ناداری ، تیسرے قرض خواہوں کا خوف کیوں کہ ان کے دم سے قرض خواہوں کو اطمینان کی صورت تھی ۔ غرض میں عجب طرح کے جنجال میں تھی ۔ اور جان وبال میں تھی ۔ ایسی ضرورت کا وقت اور گھر میں پھوٹی کوڑی نہیں حیران ، سرگردان ۔ آخر میں نے مرزا ایوب بیگ کو بلا کر کہا کہ کچھ تدبیر کرو ۔ میاں کا آخری سامان کیا جائے ۔ جب مرزا جی کہیں سے سو روپیہ لائے تو ان کے تجہیز و تکفین میں اٹھائے ۔ تیسرے روز پھول وغیرہ کیے ۔ پھول ہو چکے تھے۔

قرض خواہوں کی چڑھائی اور سسرال والوں کی برائی:

کہ قرض خواہوں نے آن کر ہجوم کیا۔ آخر نالشیں کر دیں۔ گھر کی یہ صورت ہوئی کہ جس گھر میں ایک سو ساٹھ روپیہ کی آمدنی تھی، اس میں ساٹھ روپیہ میرے زرِ وثیقہ کے رہ گئے۔ کیوں کہ ان کے سو روپیہ تو ضبط ہو گئے۔ اب کیا کروں۔ چار ہزار روپیہ کا میاں قرضہ چھوڑ گئے۔ مال و اسباب جو تھا وہ پہلے ہی سب خاک میں ملا چکے تھے۔ علاوہ اس کے دسویں، بیسویں، چالیسویں کا خرچ۔ یہ نہ ہو تو تمام خاندان میں ناک کٹے، کالا منہ ہو۔ آگے امیر کا بیٹا، گو گھر میں خاک نہ ہو۔ نام تو بڑا تھا۔ ادھر امیر محل صاحبہ، جو میری سوتیلی ساس تھیں، انھوں نے ساٹھ روپیہ کی ضمانت میاں کی دی تھی۔ اس کا تقاضا شروع کیا۔ ہر چند میں نے منت کی اور ہاتھ تک جوڑے کہ میرے اوپر یہ وقت پڑا ہے۔ خدا کے لیے تھوڑے دن خاموش ہو جاؤ۔ مگر وہ سنتی تھیں بھلا۔ وہ تو میری ساس کی سوکن تھیں۔ سو سوموں کی ایک سوم، ہزار کنجوسوں کی ایک کنجوس۔ جو جھوٹے ہاتھ سے کبھی کتے کو بھی نہ مارے، بھلا وہ میری منّت سماجت کو کب خاطر میں لاتی تھیں۔ آخر کو اُنھوں نے بھی نالش کر دی۔

والدہ صاحبہ کی بے اعتنائی:

اب ایک سہارا مجھے اپنی ماں کا تھا۔ میں یہ جانتی تھی کہ ان کا اکیلا دم ہے، پچاس روپیہ ماہوار کی آمدنی۔ ایک دم کا خرچ ہے۔ یقین ہے کہ سنتے ہی وہ میرے پاس آویں گی اور میرے رنج و راحت کی شریک ہو کر میری مدد کریں گی اور مجھے لے کر بیٹھیں گی۔ میں ان کی تشریف آوری کی منتظر تھی کہ یکایک ایک خط ان کا ایسے مضمون کا آیا، جیسے کوئی رشتہ دار یا قرابتی تعزیت کا لکھتا ہے۔ خط سنتے ہی میں تو سُن ہو گئی۔ اور دل میں کہتی تھی کہ اے ہے، ایسی ماں، جس کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ میں نے باقی نہیں رکھا۔ دو ڈھائی برس تک والدہ صاحبہ کی پنشن ریاست سے بند رہی اور

وہ اپنے مقدمات دلی اور لاہور لڑاتی پھریں۔ جب تک یہ پاٹودی نہیں گئیں، برابر ساٹھ روپیہ ماہوار، جو میری پنشن کا تھا، انھیں دیتی رہی اور طرح طرح سے خبر لیتی رہی۔ ساس سے انھی کی بدولت بگاڑی۔ خاوند انھی کے سبب ناراض رہا۔ مگر میں نے کسی کی ناراضی کا کچھ خیال نہ کیا اور برابر ان کی خدمت کرتی رہی۔ اس کے عوض والدہ صاحبہ نے یہ کیا کہ ایسے نازک وقت میں مجھ سے بے مروّتی اختیار کی اور بیگانہ وار ہو گئیں۔ سچ ہے دنیا ہے اور مطلب اپنا ہے۔ بیت:

کیا امتحاں میں نے اکثر سرور
ضرورت کی کچھ دوستی ہے ضرور

افسوس دنیا کا لہو سفید ہو گیا۔ اولاد کی محبت بھی نگوڑی جاتی رہی۔ چہ غیروں کی طرح گر پُرسے کو بھی آ جاتیں تو خاندان میں میری بات تو رہ جاتی۔ سو یہ بھی نہ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی غرض کا ملنا تھا۔ بیت:

دوست احباب جو ہیں دنیا میں
جس کو دیکھو سو اپنے مطلب کا

میکے والوں کی یہ صورت ہوئی کہ کسی نے ایسے وقت میں اتنا بھی نہ پوچھا کہ تیرے مُنہ میں کے دانت ہیں۔ سسرال والے خود خرابی کے درپے ہو گئے۔ قرض خواہوں نے نالشیں کر ہی رکھی تھیں۔ بھلا میں عورت، پردہ نشین اور ایک بچہ اور وہ بھی تین مہینے کی جان۔ حواس باختہ، عقل حیران۔ آگے عالم تنہائی۔ نہ پاس ماں نہ باپ نہ بھائی۔ عجب بے کسی کا وقت تھا۔ درودیوار بھی دشمن نظر آتے تھے۔ اس بدحواسی کی حالت میں کچھ بن نہ آیا۔

مرزا ایوب بیگ کو بلانا اور اپنی بے کسی کا اظہار کرنا:

ایک دن مرزا ایوب بیگ کو بلایا اور بہ منت ان سے کہا کہ اے مرزا جی یہ وقت میرے اوپر نہایت بے کسی کا ہے اور وقت نکل جاتا ہے، بات رہ جاتی

ہے۔ اور تم ملازم قدیم ہو۔اب سوائے خدا کے کوئی نظر نہیں آتا۔ اور مجھ کو تمھارے اوپر نہایت بھروسہ ہے۔ اِس وقت پہلو تہی نہ کرنا کہ میں تنہا ہوں اور قرض خواہوں کا بلوا ہے۔ یگانے بیگانے ہو کر مدعی بن گئے۔ میرا مونس اور مددگار کوئی نہیں رہا۔ میری حالت اِس وقت ڈوبتے ہوئے کی ہے، جو ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ تم میں اگر کچھ قدامت کی رفاقت اور ہمّت ہے تو کچھ مدد کرو۔" یہ کہہ کر میں رونے لگی۔

مرزا ایّوب بیگ کا رفاقت کرنا اور پینشن کا مقرر کرانا:

مرزا جی نے آب دیدہ ہو کر جواب دیا کہ "بیگم قسم ہے خدا کی، جب تک دم میں دم ہے، آپ کی رفاقت سے کبھی مُنہ نہ موڑوں گا۔ آپ خاطر جمع سے اپنے گھر میں بیٹھیں اور کچھ فکر نہ کریں۔ خدا مددگار ہے۔" لو بوا، میں تو اس روز سے اپنے گھر میں آرام سے بیٹھی اللہ اللہ کرتی رہی اور مرزا جی نے کمر ہمّت کی باندھ، اوّل تو میری اور میرے فرزند احمد علی خاں کی پینشن ہو جانے کے لیے درخواست کی تجویز کی۔ ہر چند سب یہ کہتے تھے کہ نواب عبدالرحمٰن خاں صاحب کی اولاد کی دوسری پشت میں پینشن نہیں ہو گی۔ مرزا جی دوسرے ہی دن صبح ہی انا کو میرے بچّے احمد علی خاں سمیت ڈولی میں بٹھا درخواست لکھ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی کوٹھی پر پہنچے۔ اور پینشن کی درخواست دی۔ بچّے کو صاحب بہادر کی گود میں ڈال دیا۔ چونکہ صاحب بہادر نہایت رحم دل اور انصاف پسند حاکم تھے، اُسی وقت پچاس روپے ماہوار کی رپورٹ پینشن کی اس مضمون سے کر دی کہ تیس روپے بچّے کے اور بیس روپے بیوہ کے مقرر ہوں۔ اور اگر لڑکا فوت ہو جائے تو تیس روپے بیوہ کو ملیں۔ یہاں کانوں کان بھی کسی کو خبر نہیں۔ جب مرزا جی اس کام سے فارغ ہوئے تو اب قرضے کا انتظام کیا۔ کسی کی قسط کی اور کسی سے وعدہ کیا اور امیر محل سے تو ایک سال تک خوب ہی تکا فضیحتی رہی، بعد ایک سال کے پینشن کی منظوری بھی آ گئی۔ جب تو دشمن اور بھی جلے۔ اور ہمیشہ اپنے جلے پھپولے پھوڑتے رہے۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ میں بیمار ہو گئی۔ میں نے والدہ صاحبہ کو اطلاع دی۔

والدہ کے ہمراہ دہلی جانا اور احمد علی خاں کا ختنہ اور نکاح کرنا :

بارے کچھ مہربان تھیں ، میرے پاس آ گئیں ۔ کوئی آٹھ روز لودھیانہ رہ کر پھر مجھ کو ہمراہ لیے دہلی چلی آئیں ۔ یہاں علاج وغیرہ کیا ۔ مجھ کو صحت ہوئی ۔ انھی دنوں میں میری ایک نند نورجہاں بیگم دہلی میں رہتی تھیں ، ان کی دختر سے میرے فرزند احمد علی خاں کی نسبت ہو گئی ۔ دوسرے ہی مہینے احمد علی خاں کا ختنہ کیا اور آخر ماہ مئی ۱۸۰۰ء کو نکاح بھی کر دیا ۔ اس کی شادی میں جو کچھ بن سکی ، دھوم دھام کی اور دلِ غم زدہ کو زبردستی خوشی میں لگانا چاہا ۔ کیوں کہ جانا کہ اب اس بچے کے سوا مجھے اور کس کی تقریب کرنی ہے ۔ مگر والدہ صاحبہ نے اپنی عادت کے موافق اس تقریب میں بھی مجھے خوش نہ ہونے دیا ۔ اور طرح طرح سے ناک میں دم کیا ۔ آخر ماہ جون کو زچ ہو کر لودھیانہ چلی گئی ۔

میرا بیمار ہونا اور والدہ صاحبہ کا لودھیانہ جا کر مجھے دہلی لانا :

کوئی چھے مہینے گزرے تھے کہ ماہ دسمبر ۱۸۰۰ء کو میں عارضۂ فالج میں مبتلا ہوئی ۔ میں نے والدہ صاحبہ کو لکھا ۔ سنتے ہی وہ میرے پاس لودھیانہ پہنچیں ۔ دیکھا تو میرا بُرا حال تھا ۔ بارہ روز سے میرا دانہ پانی بند تھا ۔ اُسی وقت درخواست رخصت کی لکھوا کر جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر لودھیانہ کی خدمت میں گزرانی ۔ دشمنوں نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا ۔ صاحب بہادر سے کہہ دیا یہ بیمار نہیں ہے ، اس کو رخصت نہ ملے ۔ صاحب بہادر نے درخواست پر حکم لکھا کہ ڈاکٹر صاحب ملاحظہ فرما کر ہمیں لکھیں تو ہم رخصت دیں ۔ دوسرے روز ڈاکٹر صاحب کو بلا کر نبض دکھائی [illegible] ۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے ضعف اور ناتوانی کو ملاحظہ فرمایا تو واقعی سخت [illegible] ۔

ڈاکٹر صاحب کا سرٹیفکیٹ دینا ، میرا دہلی آنا :

اُسی وقت ڈاکٹر صاحب نے سرٹیفکیٹ لکھ کر عنایت فرمایا ۔ جس کا

مضمون یہ ہے " سرٹیفکیٹ دیا گیا شہر بانو بیگم زوجہ نور علی خاں کہ نہایت تنگ حال میں ہے اور بہت کم زور ہے ۔ غالباً اس کے بحال ہونے کی کوئی امید نہیں ۔ اور دلی کی آب و ہوا کے واسطے مقوی سفارش کی گئی ۔ چونکہ صرف یہی وسیلہ اس کے فائدے کا معلوم ہوتا ہے ۔" لودھیانہ ۔ آررو صاحب بہادر ، سول سرجن ، مورخہ ۴ جنوری ۱۸۷۸ء ۔ دوسرے روز یکشنبہ تھا اور ڈپٹی کمشنر بہادر دورے پر تشریف لے گئے تھے ۔ اتفاق سے مولا بخش ، بھتیجا دادی زینت محل صاحبہ مرحومہ کا لودھیانہ آیا ہوا تھا ۔ دو شنبہ کو مولا بخش کو معہ سرٹیفکیٹ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی خدمت میں روانہ کیا ۔ اور سبب مولا بخش کے ہاتھ بھیجنے کا یہ تھا کہ مرزا ایوّب بیگ اُن دنوں ایک کاغذ کی نقل لینے کے لیے رُہتک گئے ہوئے تھے ۔ اور صاحب کا ڈیرہ لودھیانہ سے کوئی آٹھ میل کے فاصلے پر تھا ۔ مولا بخش نے جا کر سرٹیفکیٹ صاحب کے روبرو پیش کیا ۔ سرٹیفکیٹ کے دیکھتے ہی صاحب نے حکم دیا کہ مریضہ کو اسی وقت دلی لے جاؤ ۔ مولا بخش شام کے قریب لودھیانہ آئے ۔ میں اُسی شب کو سواری ریل میں بیٹھ کر دلی آ گئی ۔ دشمنوں کو خبر بھی نہ ہوئی ۔ دلی آ کر علاج معالجہ شروع کیا ۔

دلی رہنے کا مشورہ کرنا اور درخواست کا نامنظور ہونا:

لیکن اب سب کی صلاح یہ ٹھہری کہ لودھیانہ کی آب و ہوا موافق نہیں دوسرے ، جتنے لوگ ہیں سارے دشمن ہیں ۔ اور دشمنوں میں رہنا اچھا نہیں ۔ چنانچہ والدہ صاحبہ اور دادی زینت محل صاحبہ مرحومہ ، کہ میری ددیا ساس تھیں ، اللہ ان کو جنت نصیب کرے ، ان سب کا مشورہ ہو کر تین درخواستیں ، ایک میرے نام سے ، دوسری والدہ صاحبہ کی طرف سے ، تیسری دادی زینت محل صاحبہ کی جانب سے جناب صاحب کمشنر بہادر دلی کی معرفت لودھیانہ بھیجی گئیں ۔ اور اللہ تعالیٰ مغفرت کرے ، نواب محمد مختار حسین خاں رئیس پاٹودی بھی اُس زمانے میں زندہ تھا ، اُس نے بھی وعدہ کیا تھا کہ " پھوپی صاحبہ آپ کی پینشن کی تبدیلی میں کرا دوں گا ۔" خیر وہ

درخواستیں جب لودھیانہ پہنچیں تو دشمنوں کو بھی خبر لگ گئی ۔ آخر جناب بھائی صاحب محمد خادم علی خاں صاحب نے جا کر میری چغلی کھائی اور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر سے کہا کہ "اگر آپ اِس کی تبدیلی کریں گے تو لودھیانہ میں کوئی نہیں رہے گا۔ آپ تبدیلی نہ کریں ۔" خدا کی شان ، جس روز میرے پاس تبدیلی کی نامنظوری کا حکم آیا ہے ، اسی روز نواب محمد مختار حسین خاں کا انتقال ہوا تھا ۔ کمال ہی رنج تھا ۔ خیر اب یہ تماشا ہوا کہ جب تبدیلی کی نامنظوری ہوئی تو جو لوگ اس معاملے میں شریک ہوئے تھے ، وہ سب آپ آپ کو ہو گئے ۔ وہ کہنے لگے کہ اب جستجو کرنی بے فائدہ ہے ۔ تبدیلی نہیں ہوگی ۔ اس وقت میں بھی بہت مایوس ہوئی اور مجھ کو نہایت رنج ہوا ۔ تو مرزا ایوب بیگ نے مجھ سے کہا کہ آپ بیمار آدمی ہیں ، ہرگز فکر نہ کریں ۔ اور رنجیدہ نہ ہوں ۔ تبدیلی آپ کی ضرور ہوگی ۔ آپ خاطر جمع رکھیں ۔

تبدیلی کے منظور ہونے کا حال:

اس کے بعد ایک درخواست براہ راست جناب ڈپٹی کمشنر بہادر لودھیانہ کی خدمت میں اس مضمون سے بھیجی کہ " مجھ کو آب و ہوا لودھیانہ کی موافق نہیں ہے ۔ اور دلی کی موافق ہے اور یہاں علاج بھی ڈاکٹر صاحب سول سرجن دلی کا ہو رہا ہے ، سو میں درخواست کرتی ہوں کہ براہ مہربانی میری تبدیلی دلی کی منظور فرما کر مجھ کو مطلع فرمائیں ۔ اور اگر حضور کو میری بیماری میں کچھ شبہ ہو تو ڈاکٹر صاحب سول سرجن دلی سے حلفاً میرا حال دریافت فرمادیں ۔" اس پر جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر لودھیانہ نے صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دلی کے نام چٹھی اس مضمون سے لکھی کہ "آپ براہِ مہربانی ڈاکٹر صاحب سول سرجن دلی سے شہر بانو بیگم کا حال دریافت [illegible] اطلاع دیں ۔" چنانچہ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دلی نے ڈاکٹر صاحب سول سرجن دلی سے دریافت فرمایا ۔

ڈاکٹر صاحب کا چٹھی لکھنا اور تبدیلی کا منظور ہونا:

اس پر ڈاکٹر صاحب نے یہ جواب لکھا ۔ " چٹھی نمبری ۹۰ ، مورخہ ۱۴ مئی ۱۸۷۸ء ، بحوالہ آپ کی ڈاک نمبری پانسوانیس ، مورخہ ۱۱ مئی سنہ حال ، لکھا جاتا ہے کہ مسمات شہر بانو بیگم کو دو دفعہ دیکھا ، غالباً وہ کبھی صحت نہ پائے گی مرض ملحقہ سے ، اگر اس کی زندگی چند سال ممکن ہے ۔" جب یہ چٹھی ڈاکٹر صاحب کی جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر لودھیانہ کو پہنچی اور انھوں نے میرا حال معلوم کیا ، تو اُسی وقت میری تبدیلی کی رپورٹ کر دی ۔ چنانچہ ۱۲ جون ۱۸۷۸ء کو میرا حلیہ تبدیل ہو کر دلی کے خزانہ پر آگیا ۔ پھر تو دشمنوں نے بہتیری تدبیریں کیں ، مگر کچھ پیش نہ چلی ۔ آخر رو پیٹ کر چپ ہو رہے ۔

احمد علی خاں کا بیمار ہونا اور اس کا فوت ہونا:

لیکن ہوا ، تقدیر کی میں ایسی پوری ہوں کہ خوشی قسمت میں لکھی ہی نہیں ۔ تبدیلی ہوئی تھی ، جو لڑکا احمد علی خاں بیمار پڑا ۔ نہیں معلوم کہ وہ کم بخت کیا بیماری تھی کہ کسی کی سمجھ ہی میں نہ آئی ۔ چار برس بیمار رہا ۔ ویسے حکیموں ، انگریزی ڈاکٹروں ، ہندی ویدوں سے علاج کرائے ۔ مگر مرض کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔مرض کیا تھا گویا پیام اجل تھا ۔ اور مجھ کو اس کے ساتھ کچھ ایسا عشق تھا کہ اپنی بیماری یا دکھ سب کچھ بھول گئی تھی ۔ رات دن اُسی کا شغل تھا اور اُسی کے دھندے میں رہتی تھی ۔ آخر ۱۶ محرم ۱۲۹۹ھ (۱۱۳) کی شب جمعہ کو پنجۂ اجل نے اُسے آن دبوچا ۔ میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی ۔ میرے کئی بچے ہوئے ، وہ چھوٹی عمر میں فوت ہو ہو گئے ۔ اب خدا خدا کرکے ناک رگڑ کے اس بچے کو اتنا بڑا ہونا نصیب ہوا تھا ، خدا نے اس کو بھی اٹھالیا ۔ صبح کو جمعے کے روز اکیلا جنگل میں جا کر سو رہا ۔ میری دس برس کی محنت اللہ تعالیٰ نے آناً فاناً میں لے لی ہائے کیا خبر تھی کہ اس طرح مجھ کو بے وارثا کرکے اور آپ قبر کی گود

میں جا سوئے گا۔ ہے ہے۔ میں تو یہ جانتی تھی کہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو مٹی دے گا۔
افسوس منشئ تقدیر نے میری پیشانی پر یہی لکھا تھا۔ جو پیش آیا۔ ہائے اس کی صورت۔
اس کا بانکپن۔ اس کی تمیز۔ کس کس بات کو یاد کروں۔ کیوں کر دل کو تسلی دوں۔
جینا وبال ہے۔ رات دن اُسی کا خیال ہے۔ بیت:

نہ مرتی ہوں نہ جیتی ہوں عجب حالت ہے فرقت میں
کہ جاں عاجز قضا سے ہے۔ قضا عاجز ہے اب جاں سے

میری تو زندگی ہی خراب ہوئی اور موت بھی برباد ہوئی۔ نہ کوئی نام لیوا رہا۔
نہ پانی دیوا۔ بیت:

صبر کس کس بلا پہ کر گزروں
چارہ اس بن نہیں جو مر گزروں

لیکن خدا کا دیا سر پر۔ سوائے صبر اور کچھ بن نہ آیا۔ پر اس روز سے یہ
حال ہے کہ آج دردِ سر ہے تو کل بخار ہے۔ بیت:

مرض یہ پھیل پڑا ہے تپ جدائی سے
کہ پیٹھ لگ گئی یاروں کی چارپائی سے

نہیں معلوم کہ خدا ابھی اور کیا کیا دکھائے گا۔ کس کس طرح آزمائے گا۔
سو خیر زندگی کے دن پورے کرتی ہوں۔ جو ایسے ایسے دکھ بھرتی ہوں۔ بیت۔

غنچہ رہا۔ نہ گُل ہے۔ نہ بُلبل، نہ باغباں
کس کس کو ہائے کیجیے فصل خزاں میں یاد

غرض چالیس برس کی عمر میں دنیا کا خوب تماشا دکھیا اور دیکھتی ہوں۔

دنیا کی شکایت:

دنیا بڑی مکّار ہے۔ اس کا کیا اعتبار ہے۔ دیکھو ابتدا۔ میں مجھے کیا سبز باغ
دکھایا۔ آخر کو کس طرح خاک میں ملایا۔ ایک وہ وقت تھا کہ پانسو روپے خرچ پاندان کا

مقرر ہوا تھا ۔ اب وہی ہم ہیں کہ کُلّھم نوّے روپے میں گزارہ کرتے ہیں ۔ لاکھ طرح کے دکھ بھرتے ہیں ۔ دنیا دل بستگی کا مقام نہیں ۔ اس کا ایک جا قیام نہیں ۔ اِس پر گھمنڈ کرنا عین نادانی ہے ۔ کیوں کہ سرائے فانی ہے ۔ جو لوگ اس کا حظ اٹھاتے ہیں ۔ عزّت کے عوض میں ذلّت پاتے ہیں ۔ دنیا حسد کی جڑ ہے ۔ دنیا بے ایمانی کا گھر ہے ۔ جس نے دنیا کا لحاظ و پاس کیا ۔ اس نے اپنی عُقبیٰ کا ناس کیا ۔ حضرت معاذ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ عقل مند وہ شخص ہے کہ جو تین کام کرے' دنیا سے دستبردار ہو جائے ۔ قبل اس کے کہ دنیا اس سے دستبردار ہو ۔ اور قبر تعمیر کرائے ۔ قبل ازیں کہ قبر میں جائے اور حق سبحانہٗ تعالیٰ کو خوشنود کرے ۔ پیش ازآں کہ اس کے دیدار سے مشرّف ہو ۔ سچ فرمایا ہے ۔ دنیا کی چق چق اور بق بق پر دل لگانا عین حماقت ہے ۔ بس جس نے اس کی آرزو زیادہ کی ۔ وہی خلق کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوا ۔ اور جس نے اس کو چشمِ حقارت سے دیکھا ۔ وہ لوگوں کی نظروں میں باوقار ہوا ۔ جس نے دنیا کو چھوڑا اور اس سے مُنہ موڑا ۔ وہی مرادِ کو پہنچا ۔ اللہ تعالیٰ مجھ عاجزہ کو بھی ان نیکیوں کی پیروی نصیب کرے اور میری خطاؤں کو بخشے ۔ میں سچ کہتی ہوں کہ دنیا سے میرا دل سرد ہو گیا اور یہ خیال آیا کہ دنیا میں اپنا ہے ہی کون ۔ صرف ایک ماں کا دم ہے اور وہی قبلہ و مکرّم ہے ۔ اس کی خدمت گزاری اور رضامندی کے کام خدا نصیب کرے تو یہی سعادت مندی کی راہ اور نیک بختی کی سڑک ہے ۔ مگر قسمت کی برگشتگی سے وہ نصیب نہ ہوئی ۔

احمد علی خاں کی بیوہ کا نالش کرنا اور وثیقہ مقرر ہونا:

جب احمد علی خاں دنیا سے سدھارا تو اس کی زوجہ کی طرف سے تنخواہ کا دعویٰ پیش ہوا ۔ چنانچہ سرکارِ دولت مدار نے اُس مرحوم کی پینشن میں دس روپے اس کی بیوہ کے اور دس روپے مجھ بدنصیب کے مقرر فرمائے ۔ ہنوز یہ مقدمہ طے نہ ہوا تھا کہ

والدہ صاحبہ کا بیمار ہونا اور ان کا خط میری طلب میں آنا اور میرا پاٹودی جانا اور احمدی کا نکاح کرنا اور جبراً مجھ کو شریک کرنا اور میرے دشمنوں سے ملنا اور میری بربادی پر کمر ہمت کی باندھنا:

والدہ صاحبہ کا خط پاٹودی سے آیا کہ "میں سخت بیمار ہوں۔ دیکھتے ہی اس خط کے تم پاٹودی آؤ۔ اگر دانہ وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو۔" میں خط کے دیکھتے ہی فوراً پاٹودی پہنچی۔ اُن کی خدمت کی۔ خدا نے ان کو شفا دی۔ جب غسلِ صحت کر چکیں تو یہ احمدی، جسے آپ میرے ہاں دیکھتی ہیں، اُسے میں نے اپنے فرزند احمد علی خاں کی خدمت کے لیے پالا تھا، وہ فوت ہو گئے، یہ موجود ہے۔ والدہ صاحبہ نے اس کے نکاح کی تجویز پاٹودی ہی میں کی۔ ہر چند میں مانع ہوئی، مگر انھوں نے نہ مانا اور اس کا نکاح کر دیا۔ میں خاموش ہو رہی۔ اور کچھ شکایت میں نے نہیں کی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ میرے سوتیلے بھائی محمد جعفر علی خاں مرحوم جو تھے، اللہ ان کو جنت نصیب کرے، ان کی دختر کی شادی خادم علی خاں کی نواسی سے قرار پائی۔ اور خادم علی خاں میرے دشمنِ جاں ہیں اور لڑکی کی سرپرست والدہ صاحبہ بنیں۔ اور انھوں نے اس کی شادی وہاں کرائی اور اس شادی میں جبراً مجھ کو بھی شریک کیا۔ ہر چند مجھ کو گوارا نہ تھا، لیکن والدہ صاحبہ کی خوشنودی کی خاطر میں شادی میں شریک ہوئی اور تیوری پر میل تک نہیں لائی۔ بعد اس کے والدہ صاحبہ لودھیانہ میرے دشمن کے مکان پر گئیں اور وہاں سے لڑکی [illegible] لے کر میرے گھر تشریف لائیں۔ آٹھ دس روز رہیں۔ حالانکہ [illegible] [illegible] صاحب لے اُن کی بہو کے ساتھ تھے، مگر میں نے کچھ خیال نہ کیا۔ اور برابر خاطر داری کرتی رہی۔ اس لحاظ سے کہ والدہ صاحبہ کی طبیعت پر کسی طرح کا میل نہ آئے۔

احمدی اور اس کے خاوند کا حال:

بعد اس کے والدہ صاحبہ نے یہ کیا کہ اس احمدی کو اس کے خاوند کے گھر سے بلا لیا۔ اور چند ہی روز کے بعد اس کے خاوند سے کہا کہ تو بھی اپنے ماں باپ سے علیحدہ ہو کر میرے ہاں چلا آ۔ وہ بیچارہ ان کے کہنے کے موجب اپنے ماں باپ سے جدا ہو کر ان کے مکان پر چلا آیا۔ کوئی ایک مہینہ تو دونوں کو رکھا، بعد ایک ماہ کے دونوں کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ اب نہ وہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ آخر لاچار ہو کر دونوں میاں بیوی میرے مکان پر چلے آئے۔ میں نے خوف خدا کا کر کے دونوں کو رکھ لیا کہ یہ موجود ہیں۔

والدہ صاحبہ کی ناحق کی چغلی:

بس احمدی کا میرے مکان پر آنا تھا کہ والدہ صاحبہ کی طرف سے ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ اور میں ایسی خطا وار ٹھہری کہ دنیا میں میرے برابر کوئی گناہ گار نہ ہو گا۔ کہاں تک خفگی کا حال بیان کروں کہ خط کتابت تک بھی بند کر دی۔ اس پر بھی میں نے کچھ خیال نہ کیا، بلکہ یہ سمجھی کہ یہ چند روز کی خفگی ہے جاتی رہے گی۔

رئیسِ حال کی نانی کا مجھ کو طلب کرنا اور والدہ صاحبہ کا برافروختہ ہونا:

تھوڑے ہی دن کے بعد احمدالنسا، بیگم صاحبہ مرحومہ رئیسِ حال کی نانی نے مجھ کو طلب کیا اور والدہ صاحبہ کو بھی معلوم ہوا کہ وہ پاٹودی آتی ہے تو والدہ صاحبہ نے منتظم صاحب سے کہہ دیا کہ اس کو قلعے میں نہ آنے دو۔ جب میں اسٹیشن جاٹولی پر پہنچی

تو منتظم صاحب نے مجھ کو حکمتِ عملی سے روکا۔ مگر میں سمجھ گئی کہ یہ اشارہ والدہ صاحبہ کا ہے۔ مجھ کو اس وقت نہایت غصّہ آیا۔ اگر میں چاہتی تو پاٹودی چلی جاتی۔ مجھ کو کون روک سکتا تھا۔ مگر میں پالکی گاڑی سے اُتر پڑی اور یہ بھی چاہا کہ اسی وقت دہلی چلی جاؤں۔ مگر اس وقت کوئی گاڑی دہلی کی آتی جاتی نہ تھی۔ اُسی وقت مرزا ایّوب بیگ نے اسٹیشن ماسٹر سے ایک کمرہ کھلوا کر اس میں مجھے اتارا۔ مگر مجھ کو نہایت رنج تھا۔ جب پالکی گاڑی خالی پاٹودی پہنچی اور احمدالنساء بیگم کو یہ معلوم ہوا کہ شہر بانو بیگم نہیں آئیں اور وہ اسٹیشن پر ہیں۔ تو خدا ان کی مغفرت کرے۔ وہ بذاتِ خود اسٹیشن پر میرے لینے کو آئیں۔ ہرچند میں نے انکار کیا۔ پر انھوں نے نہ مانا۔ اور بہ منّت مجھ کو پاٹودی لے گئیں۔ غرض ایک دن اور دو شب میں پاٹودی میں رہی اور پھر دہلی کو چلی آئی۔

والدہ صاحبہ کا برافروختہ ہونا اور میرا وثیقہ بند کرانا :

والدہ صاحبہ کو جو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ اور بھی برافروختہ ہوئیں اور منتظم صاحب سے کہہ کر میرا زرِ وثیقہ رکوادیا۔ میں نے منتظم صاحب کو خط لکھا۔ اس کا جواب منتظم صاحب نے نہ دیا۔ دوسرا خط لکھا۔ اس کا جواب بھی نہ دیا۔ جب لاچار ہوئی تو ۲۳ فروری ۱۸۸۵ء کو مرزا ایّوب بیگ کو زرِ وثیقہ کی رسیدات دے کر اور ایک خط منتظم صاحب کے نام لکھ کر پاٹودی کو روانہ کیا۔ مرزا جی ٹکٹ لے کر گاڑی میں سوار ہوئے کہ اتفاق سے منتظم صاحب بھی دہلی سے پاٹودی کو جاتے تھے۔ وہ بھی اسی گاڑی میں بیٹھے اور مرزا ایّوب بیگ سے پوچھا کہ "آپ کہاں جاتے ہیں؟" مرزا جی نے جواب دیا کہ "آپ ہی کی خدمت میں زرِ وثیقہ وصول کرنے جاتا ہوں۔" اس کے جواب میں منتظم صاحب نے یہ فرمایا کہ "آپ واپس چلے جائیں۔ آپ کو وثیقہ نہیں ملنے کا۔" مرزا جی واپس چلے آئے۔ اب تو اور بھی ناچار ہوئی۔ کیوں کہ صاف جواب ملا۔

صاحب کمشنر بہادر کو مراسلہ دینا اور زرِ وثیقہ وصول کرنا:

تو تنگ ہو کر ۲۴ فروری ۱۸۸۵ء کو ایک مراسلہ جناب ملکناب صاحب (۱۱۵) کمشنر بہادر دہلی کی خدمت میں بسبیل ڈاک روانہ کیا۔ کیوں کہ صاحب کمشنر بہادر ان دنوں میں دورے پر تھے۔ چنانچہ میرا مراسلہ بمقام جھجرؔ پیش ہوا۔ چونکہ وہ حاکم نہایت رحم دل اور منصف مزاج تھے، فوراً منتظم کے نام حکم بھیجا کہ شہر بانو بیگم کا زرِ وثیقہ جلد بھیج دو۔ جب منتظم صاحب نے وثیقہ میرا بھیجا۔

والدہ صاحبہ کا لودھیانہ جا کر دہلی آنا اور ہمشیرہ زہرا بیگم کے ہاں اترنا:

بس یہ امر تو والدہ صاحبہ کو اور بھی بُرا معلوم ہوا کہ منتظم صاحب کی شکایت میں نے صاحب کمشنر بہادر سے کی۔ اس پر تو ایسے غیظ و غضب میں آئیں کہ کچھ بیان ہی نہیں۔ لو صاحب سب سے بالا بالا لودھیانہ پہنچیں اور وہاں میرے دشمنوں سے کچھ مشورہ کر ماہ اپریل ۱۸۸۵ء کو دہلی تشریف لائیں۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ ان دنوں میں میری ہمشیرہ زہرا بیگم محل سرائے میں فروکش تھیں۔ وہاں آن کر اتریں۔ میرے بھانجے سید افضل حسین نے مجھ سے آن کر کہا کہ "شب کو تو نانی نواب محل صاحبہ تشریف لائی ہیں۔ اور خالہ زہرا بیگم صاحبہ کے ہاں اتری ہیں۔ آپ کو مناسب ہے کہ آپ بھی ضرور جائیں" میں نے انکار کیا۔ اس پر مرزا ایوب بیگ نے بھی مجھ سے کہا کہ "آپ کو ضرور جانا چاہیے۔ کیوں کہ آپ کی والدہ ہیں۔" جب دو آدمیوں نے یہی صلاح دی تو میں ڈولی منگا، سوار ہو، محل سرائے میں جا اتری۔ مجھ نگوڑی کو کیا خبر کہ اُن کے دل میں کیا کچھ بھرا ہوا ہے۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ میرے سلام کا جواب نہ دیا بلکہ میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کون بلا ہے۔ جب یُوا، میں نے یہ حال دیکھا تو میں بھی چپ ہو کر بیٹھ گئی۔ تمام دن اُلٹ گیا مگر انھوں نے

مجھ سے بات تک نہ کی جب رات ہوئی تو میری بہن کی طرف مخاطب ہو کر والدہ صاحبہ نے ایسے کچھ کلمے کہے کہ مجھے بہت ناگوار گزرے اور تمام رات گویا میں انگاروں پر لوٹی۔

مرزا ایّوب بیگ کو ارادہ والدہ کا معلوم ہونا اور میرا گھر واپس آنا:

جب صبح ہوئی تو مرزا ایّوب بیگ کو معلوم ہوا کہ جس کام کے لیے والدہ صاحبہ تشریف لائیں تھیں وہ نہ ہوا۔ اس وقت مرزا جی نے مجھے کہلا بھیجا کہ "اب آپ چلی آویں، جو کچھ ہونا تھا وہ ہو لیا۔" سنتے ہی ہوا میں اپنے گھر آئی۔ جب مجھ کو مفصّل معلوم ہوا کہ والدہ صاحبہ تو میرے رزق کھونے کی فکر میں تشریف لائی تھیں۔ مگر خدا نے ان کا چیتا نہ کیا۔ اس وقت تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور مجھ کو بڑا افسوس ہوا کہ ہے ہے جس ماں کی خاطر میں نے اپنا کھوجڑا کھو دیا، تمام زمانے کو دشمن بنایا، ہزارہا روپیہ کا نقصان کیا، وہ ماں میرے ساتھ یہ سلوک کرے۔ دنیا جائے حیف ہے۔ خیر صبر اور شکر کرکے چپ ہو رہی۔ مگر مجھے ایسا صدمہ ہوا کہ اس کے سبب بیمار پڑ گئی۔

مِس تھورن صاحبہ کا تشریف لانا اور مِس فلیچر صاحبہ سے ملاقات ہونا:

مرزا ایّوب بیگ نے مجھ سے کہا کہ ایک مس صاحبہ یہاں قریب رہتی ہیں اور وہ ڈاکٹری بھی کرتی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں ان کو بلا لاؤں۔ میں نے کہا [illegible] ہے۔ دوسرے روز مرزا جی جا کر مس تھورن صاحبہ کو لے آئے۔ انھوں نے مجھے [illegible] دوا دی۔ دوسرے روز مس صاحبہ پھر تشریف لائیں۔ مگر چونکہ مس صاحبہ بہت ہوشیار اور دانا آدمی ہیں انھوں نے میرے بشرے سے دریافت کر کر فرمایا کہ بیگم تم غم زدہ معلوم ہوتی ہو۔ اور تنہا رہتی ہو۔ تم دل بہلانے کی [illegible] سے ملا

کہ "مِس صاحبہ میں کیا تجویز کروں۔" اس پر مِس صاحبہ نے کہا کہ "ایک مِس فلیچر صاحبہ نامی تھوڑا عرصہ ہوا کہ ولایت سے تشریف لائی ہیں اور بہت شریف اور خاندانی ہیں۔ اور وہ بالکل اُردو نہیں جانتیں۔ اگر تم کہو تو میں ان کو تمھارے پاس لاؤں۔ تم ان کو اُردو بولنا سکھانا، وہ تمھیں کتابیں پڑھائیں گی۔ تمھاری دل لگی خوب ہو جائے گی۔" میں نے کہا "بہت اچھا۔" چنانچہ دوسرے روز مِس تھورن صاحبہ آپ کو لے کر میرے مکان پر آئیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۲۱ مئی ۱۸۸۵ء تھی جو پہلے پہل میرے مکان پر آپ آئیں۔ اُسی روز سے میں آپ کو اُردو سکھانے لگی۔ اور آپ نے مجھ کو اردو کی پہلی کتاب شروع کرائی۔ کوئی آٹھ مہینے گزرے ہوں گے کہ اِس عرصے میں آپ سے میں چاروں کتابیں اردو کی پڑھ چکی تھی۔

میری طلب میں والدہ صاحبہ کا خط آنا اور میرا نہ جانا:

یکم فروری ۱۸۸۶ء کو ایک خط والدہ صاحبہ کا معرفت منتظم صاحب بہ دست شیخ اکرام الدین نائب وکیل میرے پاس آیا۔ مضمون اس کا یہ تھا کہ "میں سخت بیمار ہوں اور زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔ خیر جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب تم بفور دیکھنے خط ہذا کے جلد یہاں آ جاؤ۔ اور ایک روپیہ کے ولایتی انار لیتی آنا۔" خط کو پڑھتے ہی میرا یہ حال ہوا کہ ایک شُعلہ بدن میں سے اُٹھا اور دماغ کے پار ہو گیا۔ اور جو جو سلوک والدہ صاحبہ نے میرے ساتھ کیے تھے وہ سب ایک تصویر بن کر میرے رُوبرو آ گئے۔ بس جواب خط کا تو میں نے نہیں لکھا۔ مگر شیخ اکرام الدین سے زبانی کہہ دیا کہ "شیخ جی اب تو پانی سر سے بھی بلند ہو گیا۔ کیسا ملنا اور کیسا جانا۔ کہہ دینا کہ مجھ سے کسی امر کی توقع رکھنا فضول ہے۔" یہ کہہ کر اُن کو رخصت کیا۔ اور آپ سے برابر سبق ہوتا رہا۔ آپ توجہ قلبی اور کوششِ دلی سے چاروں کتابیں اُردو کی (۱۱۶) اور "تاریخ مختصرِ ہند" (۱۱۷) اور "حالات النسا" (۱۱۸)، "مراۃ العروس" (۱۱۹) وغیرہ پڑھ چکی۔ اور اب رومن اُردو پڑھتی ہوں اور حساب وغیرہ بھی تقسیم تک کر چکی۔ جب آپ کی آمدورفت کو عرصہ

ایک سال کا گزر گیا اور گزشتہ حالات کا جو جو کچھ تذکرہ آپ سے ہوا تو آپ مصر ہوئیں کہ اپنی سوانح عمری لکھ کر مجھے دو ۔ سو آپ کی خاطر سے میں نے اپنی بیتی کہانی یعنی روز پیدائش سے آج تک جو کچھ گزرا تھا وہ لکھ کر آپ کو دیا ۔ اب تو آپ نے مجھ عاجزہ کا قصہ سنا ۔ سچ کہنا کہ مجھ جیسے بدنصیب دنیا میں دیکھے کیا ۔ سُنے بھی نہ ہوں گے۔ اب آپ خیال کریں کہ روزِ پیدائش سے لوگوں کو مجھ سے حسد شروع ہوا ۔ غدر میں کیسی مصیبت اٹھائی ۔ ساس کی کیسی کیسی سختیاں سہیں ۔ سسرال والوں نے کیا کیا بدسلوکیاں کیں ۔ خاوند نے یوں برباد کیا ۔ اولاد سے یہ پھل ملا کہ ایک بھی زندہ نہ بچا ۔ ایک ماں تھی ۔ سو اس نے یہ کیا کہ خون کی پیاسی ہو گئی ۔ اگر چھری کو پائیں تو مجھ کو نہ پائیں ۔ سو ہوا ۔ میرے ساتھ تو کسی نے بھی بھلائی نہ کی۔

مرزا ایوب بیگ کا شکریہ اور بیتی کہانی کا خاتمہ :

سوائے مرزا ایوب بیگ کے ۔ انھوں نے البتہ میرے ساتھ ایسی رفاقت کی کہ اپنی قدامت کا حق ادا کر دیا ۔ اگر یہ شخص میری رفاقت نہ کرتا تو آج کو مجھے بھیک بھی نہ ملتی۔ یہ اسی شخص کا حسنِ انتظام تھا کہ اس وقت میں میرے قرضے کا کہ جو چار ہزار روپیہ کا میرا خاوند چھوڑ کر مرا تھا ۔ بندوبست کیا ۔ علاوہ اس کے دشمنوں کی زد سے مجھ کو بچایا۔ اور آج تک ساتھ آبرو کے اپنے گھر میں بیٹھی ہوں ۔ اور جو کارخانہ میرے خاوند کے وقت میں تھا ۔ اس وقت تک بدستورِ سابق موجود ہے ۔ اگر اس شخص کا شکریہ میرا ایک ایک رونگٹا ادا کرے تو نہیں ہو سکتا ۔ اللہ تعالیٰ مرزا موصوف کو جزائے خیر عنایت کرے ۔ اور مجھ کو بھی اپنے سیدھے رستے پر قائم رکھے۔

اہدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم

غیر المغضوب علیہم ولا الضالین

آمین آمین

○ تعلیقات

○ فہرستِ اسنادِ مُحوّلہ

○ اشاریہ

تعلیقات

(۱) MISS FLETCHER ، مصنف نے ہر جگہ اس کا املا فلیچر لکھا ہے۔ اس خاتون کے بارے میں مصنف نے مزید تفصیلات تحریر نہیں کیں۔ اغلب ہے کہ اس کا نام G. M. FLETCHER اور اس کا تعلق BAPTIST ZANANA MISSION سے تھا۔ ۱۸۸۶ء تا ۱۸۹۶ء میں اس کے دلی میں رہنے کی شہادت ملتی ہے۔ "THACKER'S INDIAN DIRECTORY" (لندن ، ۱۸۸۸ء) ص ۱۲۲۲ ، (۱۸۹۰ء) ص ۱۳۵۸ ، (۱۸۹۱ء) ص ۱۳۲۶ ، (۱۸۹۲ء) ص ۱۳۸۹ ، (۱۸۹۳ء) ص ۱۴۰۳ ، (۱۸۹۴ء) ص ۱۴۲۰ ، (۱۸۹۵ء) ص ۱۴۹۲ ، (۱۸۹۶ء) ص ۱۵۰۴۔

(۲) مطابق ۱۸۴۸ء

(۳) فرزند نواب فیض طلب خاں ، جن کے حالات مقدمے میں اور آگے متن میں درج ہیں ۔ ۲۵ شعبان ۱۲۲۹ھ ۔ ۱۸۱۳ء کو پیدا ہوئے اور اپنے والد کے انتقال (۱۸۲۹ء) کے بعد پاٹودی کی امارت پر متمکن ہوئے ۔ یکم رمضان ۷۸ ۱۲ھ ۱۸۶۲ء کو انتقال کیا۔

(۴) نواب فیض محمد خاں (متوفی ۱۸۳۵ء) رئیس جھجّر کے سب سے بڑے فرزند اور جھجّر کے آخری نواب۔ ۱۸۴۵ء میں تخت نشین ہوئے ۔ مقدمہ اور متن میں گاہے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۵) ضلع روہتک ، پنجاب کی تحصیل ۔ کل رقبہ ۴۶۹ مربع میل ، آبادی تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار اسے ۱۸۲۰ء میں نواب نجابت علی خاں ، نسلاً پٹھان نے قائم کیا ۔ کچھ تفصیلات آگے متن میں آتی ہیں۔

(۶) " یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور قریب لاکھ روپیہ کے اس میں صرف ہوا ۔ اور سب رئیسان اور سرداران گردونواح اور صاحبان انگریز ، مثل نواب ضیاء الدین خاں لوہارو والہ و راجہ نیمرانہ اور نواب دوجانہ ۔ مسٹر تھومس تھیوفلس مٹکاف کمشنر و ایجنٹ دہلی ، مسٹر گتری ، مسٹر راس ڈپٹی کلکٹر ضلع رُہتک ، مسٹر روڈ کلکٹر ضلع گوڑگانوں اس میں شریک ہوئے ۔ سہرہ بندی نوشہ کی مٹکاف نے اپنے ہاتھوں کی ۔ دو مہینے پہلے سے محفلِ رقص و سرود شروع ہو گئی اور قریب دو سو طائفہ زنانہ اور مردانہ نقال اور تماشہ گروں انگریزی وغیرہ جمع ہو گئے تھے ۔ تمام شہر اور چھاؤنی کی ضیافت کی گئی تھی اور پندرہ روز پہلے سے ٹھاٹ بندی باغ جہاں آراء سے تا قلعہ کہ فاصلہ پون میل کا ہو گا ، ہر رات کو روشنی ہوتی تھی اور آتش بازی چھوٹا کرتی تھی ۔" منشی غلام نبی " تاریخِ جھجر " ص ۲۵۲۔۲۵۳، یہاں تاریخِ نکاح : ۶ مارچ ۱۸۵۳ء درج ہے۔

(۷) متوفی ۱۸۶۱ء

(۸) 'بیوی کی صحنک' کی تقریب سیّدہ فاطمہؓ سے منسوب تھی ۔ اور عورتوں میں عام تھی ۔ اس کے لیے میدے کی ٹکیاں گھی میں تل کر کونڈوں میں بھری جاتیں اور انھیں صرف عورتیں ہی کھاتیں ۔ مردوں کا انھیں کھانا یا قریب جانا گناہ سمجھا جاتا۔

(۹) گوری شنکر (چھٹا قلزم ، ص ۶۴) نے یہ دلچسپ اطلاع دی ہے کہ ریاست کی کل فوج ۱۰۴ سپاہیوں پر مشتمل تھی ؛ جو انیسویں کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں گھٹ کر صرف ۳۲ سپاہیوں پر مشتمل رہ گئی ۔

" THE IMPERIAL GAZETTEER OF INDIA " جلد ۲۰ ص ۲۰۔

(۱۰) " قیصر التواریخ " مصنفہ : کمال الدین حسینی ، جلد ۲ (لکھنؤ ، ۱۹۰۷ء) ص ۴۵۰ میں تحریر ہے :

" غلام فخر الدین خاں ، بدمعاشِ شہر ، جو کمشنر صاحب کی سفارش سے تحصیل دار علاقہ کورٹ قاسم ہوا تھا ، بعد ارسال زرِ تحصیل خزانہ شاہی میں جمعیت پچاس سوار سے اپنے علاقہ سے پھر آتا تھا ، جس دن پاٹودی میں پہنچنے لگا ، محمد تقی خاں بڑے نواب کو راہ میں گرفتار کر کے پانچ لاکھ روپے مانگنے لگا ۔ جب نواب صاحب کو خبر پہنچی ، حکم کیا کہ انھیں مار دے ، میرے بیٹے کو لے آؤ ۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ان پچاس میں سے ایک کو جیتا نہ چھوڑا ۔ محمد تقی خاں کو بسلامت لے آئے ۔ فخرالدین خاں بھاگ کر ریواری پہنچا ۔ اور تلا رام وہاں کے رئیس کو اپنے ساتھ لے کر نواب کا گھر لوٹا ۔ آگ لگا دی ۔ نواب رات کو مع عیال جھجر چلے گئے ۔ "

یہ واقعہ چارلس میسی ، تصنیف مذکور ، ص ۴۲ میں اس طرح بیان ہوا ہے :

" ۔ باغی رسالدار محمد شیر خاں کچھ سواروں کے ساتھ پاٹودی میں داخل ہوا اور اس نے بادشاہ دہلی کی طرف سے بحال شدہ سلطنت کے اخراجات کے واسطے تین لاکھ روپے طلب کیے اور نواب کے بیٹے تقی خاں کو گرفتار کر کے مطالبے کی ادائگی کے لیے بطور یرغمالی رکھا ۔ اس وقت نواب کو لڑنے میں عافیت نظر آئی ۔ لاچار جنگ کی اور پچاس ' باغی ' قتل کیے ۔ مگر شیر خاں نے کمک منگائی اور نواب کو شکست دے کر نارنول کی طرف بھگا دیا اور پاٹودی کو لوٹ لیا ۔ "

مصنف کے بیان کردہ واقعات اور محولہ بیانات سے قطع نظر ان واقعات کو خود نواب اکبر علی خاں نے اپنے ایک خط مشمولہ سلیم قریشی " غداروں کے خطوط " (دہلی ، ۱۹۹۴) ص ۹۹ میں اس طرح بیان کیا ہے :

" آج کل رسالدار شمشیر خاں ، چالیس سواروں کے ساتھ ، جس کی پلٹن کا نام معلوم نہیں ، یہاں آیا ہوا ہے ۔ اس نے میرے سب سے بڑے بیٹے محمد تقی علی خاں کو کسی بہانے سے بلوا کر قید کر لیا اور اس کو رہا کرنے کے لیے

تین لاکھ روپے کا مطالبہ کیا ۔ کافی گفت و شنید کے بعد وہ نقدی اور زیوارات کی صورت میں ساٹھ ہزار روپے دے کر رہا کرایا گیا ۔ اس کے بعد رسالدار نے میری جائیداد پر ہاتھ ڈالنے شروع کر دیئے اور پاٹودی کے لوگوں کو لوٹنے اور قتل کرنے لگا۔ میں نے مشورہ اور مدد کے لیے جھجّر کے نواب کو لکھا ۔ نواب کے وزیر کی اطلاع کے مطابق میرے رشتے داروں اور شہریوں نے ان باغیوں کا مقابلہ کیا، جس کی وجہ سے دس سوار اور ہمارے سات یا آٹھ آدمی زخمی ہو گئے ۔ باغیوں سے ڈر کر میں جھجّر چلا آیا اور نواب کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے میں کرنال چلا آیا ہوں ۔ میرے پاٹودی سے روانہ ہونے کے فوراً بعد قرب و جوار کے لوگوں نے میری جائیداد لوٹ لی ۔ اب میں دوبارہ جھجّر آ گیا ہوں ۔"

سلیم قریشی کے مطابق نواب اکبر علی خاں نے اسی موضوع پر بہادر شاہ ظفر کو بھی ایک خط لکھا تھا ۔ بہادر شاہ ظفر نے شمشیر علی خاں رسالدار کو نواب پاٹودی کے ساتھ زیادتی کرنے کی پاداش میں نکال دیا تھا اور اس کی سرزنش کی تھی ۔ ایضاً ۔ نواب اکبر علی خاں کے اس خط کے تعلق سے خود بہادر شاہ ظفر کے ایک خط بنام نواب اکبر علی خاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کو خود ان کے اپنے ذرائع اور بالخصوص درگا پرشاد، رجسٹرار پاٹودی سے ان حالات کا علم ہو چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے مبینہ رسالدار محمد خاں (شمشیر خاں) کے مذکورہ عمل کو اس کا ذاتی عمل بتاتے ہوئے نواب کو اپنی سابقہ حیثیت میں اپنی ریاست میں واپس چلے جانے کی تلقین کی۔ مکتوب، مورخہ ۱۱ اگست ۱۸۵۷ء، مشمولہ : " پروسیڈنگز آف دی ٹرائل آف محمد بہادر شاہ..." ص ۲۳ ۔

ان واقعات کی ایک اور شہادت نواب عبدالرحمٰن خاں کے ایک خط بنام گریٹ ہیڈ (GREAT HED) مورخہ ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء میں ملتی ہے۔ مشمولہ: سلیم قریشی، ص ۱۳۶۔ ۱۳۰، لیکن یہاں ادائیگی کی مالیت چھے ہزار روپے بتائی

گئی ہے ۔ دو ہزار روپے نقد اور چار ہزار روپے زیورات کی صورت میں۔
مزید لکھا ہے کہ : " لڑائی میں جو ماردھاڑ ہوئی اس میں بارہ سوار اور تقریباً
اتنے ہی شہری ہلاک ہوئے۔ پاٹودی کا نواب اپنے خاندان کی عورتوں اور
بچوں سمیت پاٹودی سے بھاگ کر جھجرؔ آ گیا۔ نجف گڑھ میں باغیوں کی فوج
کے انتقام سے ڈر کر ، جو ہانسی روانہ ہونے والی تھی ، وہ جھجرؔ سے کرنال چلا
گیا اور اب وہیں ہے۔"

(۱۱) منشی جیون لال نے بھی اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔ مشمولہ مٹکاف ، تصنیف مذکور ، ص ۲۰۲ ۔

(۱۲) کمال الدین حسینی ، " قیصر التواریخ " جلد دوم ، ص ۴۵۷ ، نواب اکبر علی خاں کا مذکورہ خط ، مشمولہ سلیم قریشی ، تصنیف مذکور ، ص ۱۴۹ ، ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے :

" امیدوار ہوں کہ آپ کی عنایت اور مدد کے ساتھ دوبارہ اپنی گدّی حاصل
کر سکوں گا ۔ جھجرؔ کا نواب سرکار کا بھی خواہ ہے اور ہمیشہ سرکار کے حکم
کی تعمیل کے لیے تیار رہتا ہے ۔ میں خود بھی آپ کا تابعدار ہوں"

چارلس میس ، تصنیف مذکور ، ص ۴۳ کا بیان ہے :

" غدر کے دنوں میں سرکار کے ساتھ وفادار رہنے کے باعث یہ (محمد اکبر
علی خاں) اس مصیبت سے ، جو ان کی ہمسر ریاستوں جھجر ، فرخ نگر اور
بہادر گڑھ پر پڑی ، محفوظ رہے ۔ انھوں نے ضلع کے انتظامی افسر فورڈ کی مدد
کے لیے کچھ سوار بھیجے اور چند انگریزوں کو ، جنھیں گوڑگانوں میں اپنی جان کا
خطرہ تھا ، ضلع گوڑگانوں کے پرگنہ بھورا میں سرکشی ہوئی تو اس [illegible]
کرنے میں بھی انھوں نے مدد دی ۔"

(۱۳) فورڈ (FORD) یہ قبل ازیں بنگال سروس سے متعلق تھا۔

(۱۴) گوڑگاؤں کی ایک تحصیل

(۱۵) گاؤں کا نام ، تحصیل

(۱۶) غالب نے ان کی " مجرموں کی طرح " گرفتاری کے بعد دلی لائے جانے کی تاریخ ۲۰ اکتوبر تحریر کی ہے ۔ " دستنبو " (لاہور ، ۱۹۶۹ء) ص ۶۶ ، انھیں پھانسی اس کے باوجود دی گئی کہ ان کا رویّہ بغاوت کے دوران بین بین رہا ۔ ان کا مذکورہ مکتوب بنام گریٹ ہیڈ (GREAT HED) مورخہ ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء مشمولہ : سلیم قریشی ، غدّاروں کے خطوط " ص ۱۳۰ میں ان کے کردار اور رویّے کا یہ روپ سامنے لاتا ہے :

" ۔ جہاں تک جھجّر کا تعلق ہے ، خود بادشاہ نے پچھلے ماہ پانچ لاکھ روپے ادھار لینے کے لیے چار یا پانچ مرتبہ میرے پاس قاصد بھیجے اور ہر قاصد کے ساتھ نو یا دس سوار ہوتے تھے ۔ میں جتنا عرصہ ان کو نظر بند رکھ سکتا تھا ، رکھا ۔ آخر تقریباً چھ دن ہوئے لکھنؤ کی رجمنٹ کے دو دستے ایک اور خط لے کر آئے ، جس میں مجھے اپنی تمام فوج لے کر نذرانے کے ساتھ دربار میں حاضر ہونے کے لیے کہا گیا تھا ۔ ان فوجیوں نے مجھے خوف زدہ کیا اور میرے فوجیوں کو بغاوت کی ترغیب دی ۔ آخر تنگ آ کر میں نے اپنی فوج کے افسروں کو بلایا اور ان کی رائے پوچھی ۔ ان میں سے کچھ نے کہا انھیں بادشاہ کی مدد کے لیے دلی جانا چاہیے ۔ دوسروں نے رائے دی کہ ان کی ذمے داری جھجّر کی حفاظت کرنا ہے ۔ میں نے ان سے کہا کہ اتنی چھوٹی سی فوج سے باغی فوج کا کوئی فائدہ نہ ہو گا ۔ اور ان سے جھجّر نہ جانے کی التجا کی ۔ بالآخر میں ان کی (مراد جھجّر کے فوجیوں سے ہے) جھجّر سے روانگی ملتوی کرنے میں کام یاب ہو گیا ۔ اب کیولری کے دو دستے یہاں آ پہنچے ہیں ۔ میں ان کے ساتھ بھی احتجاج اور وعدے کر کے ٹال مٹول کرتا رہا اور ان کو جھجّر چھوڑ کر ہانسی جانے والی فوج میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا ۔ البتہ میری فوج کے کچھ سپاہی ان کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئے ۔ آخر مجبور ہو کر مجھے ان کو ساٹھ ہزار روپے دینے پڑے اور وعدہ کیا کہ چالیس ہزار روپے میں ان کو پندرہ دن کے اندر بھیج دوں گا ۔ میں نے اپنی فوج کو ان کے ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا ،

کیوں کہ مجھے اپنے محلوں کی حفاظت کے لیے اس کی ضرورت تھی ۔ میرے لیے یہ رقم دیے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو اور دوسرے کمانڈروں کو ان تمام حالات سے آگاہ کروں ۔ ۔"

(۱۷) ۱۸۵۸ء۔

(۱۸) ۱۸۹۱ء۔

(۱۹) چارلس بیس نے ۱۸۶۲ء تحریر کیا ہے ۔ تصنیف مذکور ، ص ۲۳۔

(۲۰) ان کے حالات کے لیے : دارا شکوہ " سفینۃ الاولیا " مطبع نول کشور ، کان پور ، ۱۹۰۰ء ، ص ۹۱۔۹۲۔

(۲۱) میر خورد " سیر الاولیا " ۔ مطبع محب ہند ، دہلی ۱۳۰۲ھ ، ص ۵۲۔۵۳ و نیز ترجمۂ اُردو ، اعجاز الحق قدوسی ، لاہور ، ۱۹۸۰ء ص ۱۲۲۔۱۲۳ دارا شکوہ ، ص ۹۱ ، غلام سرور لاہوری " خزینۃ الاصفیا " جلد اول ، مطبع نول کشور ، لکھنو ، ۱۹۱۴ء ، ص ۲۵۱ ، الہدیہ چشتی " سیر الاقطاب " (مطبع نول کشور لکھنو ، ۱۹۱۳ء) ص ۸۸

(۲۲) عبدالرحمٰن جامی (نفحات الانس " مطبع لیسی ، کلکتہ ، ۱۸۵۸ء ، ص ۳۳۰ و نیز لاہور ، ۱۹۲۰ء ، ص ۲۲۰) اور دارا شکوہ (ص ۹۱) نے انھیں " شاہ سنجان " اور الہدیہ چشتی (" سیر الاقطاب " ترجمۂ اردو ، سید محمد علی جویا مراد آبادی ، مطبع نولکشور ، لکھنو ، ۱۸۸۸ء ، ص ۱۰۶ اور معین الدین دردائی ، کراچی ، ۱۹۲۰ء ، ص ۱۲۲) نے " سجان " لکھا ہے ۔ سنجان ، خواف ، نیشاپور کے قریب ایک موضع تھا ۔

(۲۳) محمود ۔ محمد ۔ نسخہ مطبع لیسی ، کلکتہ ، ۱۸۵۸ء ، ص ۳۳۰۔

( ) و از دہ سنجان خواف است ۔ شرف صحبت خواجہ را دریافتہ بود [illegible]

(۲۵) وقت ۔ مدت ۔ نسخہ کلکتہ ، ص [illegible]

(۲۶) چوں درخواستی ۔ چوں خواستی ، ایضاً

(۲۷) مزار ۔ مراد ایضاً

(۲۸) روانہ باشد ۔ [illegible] ایضاً

(۲۹) ۱۱۳۲ء

(۳۰) ۱۲۰۰ء

(۳۱) سبحان ۔ سیر الاقطاب " مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۱۳ء، ص ۸۸ ۔

(۳۲) میگفتند ۔ ایضاً

(۳۳) ۱۲۰۲ء

(۳۴) مصنف نے " بڑنیچ " لکھا ہے، جب کہ یہ " بڑہیچ " بلکہ " بڑیچ "، پٹھانوں کا ایک قبیلہ ہے ۔

(۳۵) ریاست روہیلکھنڈ کے بانیوں میں سے ایک ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء کے لگ بھگ ہندوستان آیا، اولاً گھوڑوں کی تجارت کی اور کٹھیر کو اپنا مسکن بنایا اور عسکری قوت حاصل کی۔ آس پاس کے زمین داروں سے محاربے کیے۔ ۱۱۳۹ھ / ۱۷۲۶ء میں راجہ کمایوں کی قید میں جان دی ۔ تفصیلات کے لیے: سیّد الطاف علی بریلوی " حیاتِ حافظ رحمت خاں " (کراچی، ۱۹۶۳ء) ص ۴۸۔ ۵۱، دور آفریدی " تاریخِ روہیلکھنڈ " (رامپور، ۱۹۸۹ء) ص ۲۳۔ ۶۲، مصطفی حسین نظامی " تاریخِ روہیل کھنڈ" (بریلی، ۱۹۸۶ء) ص ۱۷، ۲۳۔ ۳۰ وغیرہ۔ بالخصوص حکیم نجم الغنی " اخبار الصّنادید" جلد اوّل (لکھنؤ، ۱۹۱۸ء) ص ۵۹۔ ۷۰، جہاں اس کے حسب نسب پر معلومات اور حالات کا تجزیہ ملتا ہے۔

(۳۶) ۱۵۶۵ء

(۳۷) یہاں کوئی غلط فہمی یا خلطِ مبحث ہو گیا ہے ۔ چارلس میسی نے انھیں " شیخ پیر مست " لکھا ہے، جو اکبر کے عہد میں ہندوستان آئے تھے ۔ ص ۲۱، اسی خاندان کے موجودہ عہد کے ایک فرد نوابزادہ شیر علی خاں نے اپنے ایک جداعلیٰ پیر محمد یا پیر محمد مات کا ذکر کیا ہے، کہ ۱۵۶۱ء کے اوائل میں سارنگ پور (مالوہ) کی فتح کے بعد وہ شہنشاہ اکبر کے رضاعی بھائی آدھم خاں سے مل گئے تھے اور بعد میں آدھم خاں پر عتابِ شاہی نازل ہونے اور اس کے قتل ہو جانے کے باوجود وہ اپنی زیرکی کی وجہ سے زندہ رہنے میں کام

یاب ہوگئے۔ تصنیف مذکور، ص ۱، جب کہ تذکروں میں یہاں اور اسی عہد میں پیر محمد خاں شروانی کا ذکر ملتا ہے، جو بیرم خاں کی تربیت اور معاونت سے امرائے دربار اکبری میں شامل ہو گیا تھا، پنج ہزاری منصب دار اور عالم و فاضل شخص تھا اور فتح مالوہ کے بعد اکبر نے اسے مالوے کا حاکم بنا دیا تھا۔ اس کے بعد ۱۵۶۲ء میں اس نے خاندیش کے حکمراں میراں محمد شاہ فاروقی سے، جو مالوے کے حاکم باز بہادر کا شریک تھا، جنگ لڑی اور شکست کھائی اور فرار ہوتے ہوئے دریائے نربدا میں ڈوب کر ہلاک ہوا۔ تفصیلات کے لیے: شاہنواز خاں - مآثرالامراء اردو ترجمہ محمد ایّوب قادری جلد سوم، (لاہور، ۱۹۷۰ء) ص ۱۵۰۔ ۱۶۱، شیخ فرید بکھری - ذخیرۃ الخوانین - جلد اوّل (کراچی، ۱۹۶۱ء) ص ۱۰۱۔ ۱۰۳، ابوالفضل - آئینِ اکبری - انگریزی ترجمہ، ایچ بلوخ مین، جلد اوّل (لاہور، ۱۹۷۵ء) ص ۳۴۲۔ ۳۴۳، خواجہ نظام الدین احمد - طبقاتِ اکبری - اردو ترجمہ، جلد دوم، محمد ایّوب قادری (لاہور، ۱۹۹۰ء) ص ۳۴۶۔ ۳۴۷۔

(۳۸) ۱۵۹۴ء

(۳۹) ۱۶۲۳ء

(۴۰) - تزکِ جہانگیری - انگریزی ترجمہ، جلد دوم (لاہور، ۱۹۷۵ء) ص ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۹۔

(۴۱) ایضاً، ص ۲۵۱۔

(۴۲) ایضاً۔

(۴۳) تفصیلات کے لیے: بنارسی پرشاد سکسینہ "HISTORY OF SHAHJAHAN OF DEHLI" (الہ آباد، ۱۹۶۲ء) ص ۲۳۰، ۲۳۱۔ ۲۳۴۔

(۴۴) ۱۶۳۲ء

(۴۵) محمد وارث کامل - تذکرۂ اولیائے لاہور - (کراچی، ۱۹۶۳ء) ص ۳۱۴۔

(۴۶) ۱۶۷۷ء

(۴۷) ۱۷۰۷ء ۔ ۱۷۱۲ء

(۴۸) ۱۶۶۶ء ۔ ۱۷۰۸ء

(۴۹) شاہنواز خاں، تصنیف مذکور، جلد سوم، ص ۱۱۲۔

(۵۰) ۱۷۱۲ء

(۵۱) ۱۷۱۹ء ۔ ۱۷۴۸ء

(۵۲) افغانستان سے، ایک ممتاز افغان سالار، جس نے بہت جلد اپنی طاقت اور صلاحیت سے علی وردی خاں کو متأثر کیا اور ۱۴ ہزار سواروں کی ایک ذاتی فوج منظم کر لی ۔ جادو ناتھ سرکار " FALL OF THE MUGHAL EMPIRE " جلد دوم (کلکتہ، ۱۹۷۱ء) ص ۷۰ وبعدہٗ ۔

(۵۳) مصطفیٰ خاں کے حوالے سے اس جنگ کی تفصیلات " تاریخِ جھجر " مصنفہ : منشی غلام نبی میں ہیں۔

(۵۴) ۱۶۷۶ء ۔ ۱۷۵۶ء

(۵۵) تفصیلات کے لیے : سرکار، تصنیف مذکور، ص ۷۰۔ ۷۳، کالی کنکر دتا " علی وردی خاں اور اس کا عہد " اردو ترجمہ: عبدالاحد خلیل (دلی، ۱۹۸۵ء) ص ۱۵۶۔ ۱۶۷۔

(۵۶) ۲۰ فروری ۱۷۴۵ء، سرکار، تصنیف مذکور، ص ۷۳۔

(۵۷) کالی کنکر دتا، تصنیف مذکور، ص ۱۶۷۔

(۵۸) ۱۷۴۵ء میں ۔ جیمز برجس (JAMES BURGESS) " A CHRONOLOGY OF MODERN INDIA " (ایڈنبرا، ۱۹۱۳ء) ص ۱۸۴۔

(۵۹) غلام حسین طباطبائی (" سیر المتاخرین " انگریزی ترجمہ کلکتہ ۱۷۸۹ء، جلد دوم، ص ۵۴۴) نے اسے بھتیجا بتایا ہے ۔ یہیں (ص ۵۴۱۔۵۴۲) اس کے ایک بیٹے کا نام مرتضیٰ خاں بھی بتایا ہے، جو مصطفیٰ خاں کے قتل کے بعد گرد در

فرار ہو گیا۔ ص ۵۴۵۔

(۶۰) چارلس میسی کے مطابق الف خاں اپنے جدِّ اعلیٰ شیخ پیر مست سے سات پشت بعد ہوئے اور یہ نواب جھجر نجابت علی خاں کے باپ مرتضیٰ خاں کے رفیق تھے۔ ص ۲۱۔ ۲۲

(۶۱) صفدر جنگ، ۱۷۳۹ء۔ ۱۷۵۴ء، لیکن چارلس میسی نے انھیں نواب شجاع الدولہ کا ملازم کہا ہے، ص ۲۲

(۶۲) دہلی میں یہ شاہ عالم (۱۷۵۹ء۔ ۱۸۰۶ء) کی فوج میں ایک بڑے جنگی عہدے پر ممتاز ہو گئے۔ یہ ایک نام ور سپاہی تھے، جنھوں نے کئی معرکوں میں خوب دادِ شجاعت دی۔ ایضاً

(۶۳) ۱۷۸۷ء

(۶۴) کمشنر دہلی کو اس کے "پولیٹیکل ایجنٹ" کی حیثیت حاصل تھی اور پاٹودی کے علاوہ اس وقت دہلی کے ماتحت یہ نیچے ریاستیں تھیں: جھجر، فرخ نگر، بلب گڑھ، لوہارو، دوجانہ، بہادر گڑھ

(۶۵) نواب ممتاز حسین خاں

(۶۶) سی یو ایچی سن (C. U. AITCHISON) نے سہواً انھیں فیض طلب خاں کا بھائی تحریر کیا ہے:

"A COLLECTION OF TREATIES, ENGAGEMENTS AND SANADS"

(کلکتہ، ۱۸۹۲ء) حصۂ اوّل، ص ۴

(۶۷) چارلس میسی، تصنیف مذکور، ص ۲۲

(۶۸) ۱۷۶۱ء۔ ۱۷۹۳ء

(۶۹) ۱۷۷۸ء۔ ۱۸۰۳ء

(۷۰) یہ واقعہ ۱۷۹۱ء کا ہے۔ نجم الغنی "تاریخ راجگان ہند" (لکھنؤ، ۱۹۳۲ء) ص ۳۳۳۔

(۷۱) [illegible]

(۷۲) اس جنگ کی تفصیلات ہنری بیوریج (HENRY BEVERIDGE)
"A COMPREHENSIVE HISTORY OF INDIA" مرتبہ : جی پی
گپتا، جلد دوم (دہلی ۱۹۷۰ء) ص ۹۸۵۔ ۹۸۸ میں ہیں۔

(۷۳) اور خود سندھیا نے ان کو پرگنہ رُہتک عطا کیا۔ اس موقعے پر چند گاؤں بھی ملے، جو جھجر میں شامل ہوئے۔ مگر ثبوت نہیں کہ یہ علاقے ان کے قبضے میں آئے۔ چارلس بیسی، تصنیف مذکور، ص ۲۲

(۷۴) شاہ عالم نے انھیں لارڈ لیک کی خدمت میں پیش کیا، جس نے ہُلکر کے مقابلے میں ان سے چنبل گھاٹ پر کام لیا۔ ایضاً۔

(۷۵) WILLAM MONSON (۱۷۶۰ء۔ ۱۸۰۷ء) اس وقت کرنل تھا، ہنری بیوریج ، تصنیف مذکور، ص ۹۸۵۔ ۹۸۶۔

(۷۶) فیض طلب خاں بکندرہ، رام پورہ، بھان پورہ اور کئی لڑائیوں میں پیش پیش رہے۔ چارلس بیسی، تصنیف مذکور، ص ۲۲

(۷۷) BOURGUIN LOVIS ،

(۷۸) یہ واقعہ اپریل ۱۸۰۴ء کا ہے۔ وی اے اسمتھ (V. A. SMITH)
"THE OXFORD HISTORY OF INDIA" مرتبہ : پرسی ویل اسپیئر
(PERCIVAL SPEAR)، (کراچی، ۱۹۸۳ء) ص ۵۵۶۔

(۷۹) بھان پورہ کی لڑائی میں۔ چارلس بیسی، تصنیف مذکور، ص ۲۲

(۸۰) تقریباً سات ماہ بعد۔ ایضاً

(۸۱) اس قصبے کا دوسرا نام "حسین آباد" تھا، جو دہلی سے تقریبا ۱۰ کلو میٹر کے فاصلے پر جنوب مغربی سمت میں واقع تھا۔ ریاست جھجر کی ضبطی (۱۸۵۷ء) کے بعد انگریزوں نے اسے خیر خواہی کے صلے میں مہاراجہ پٹیالہ کو بخش دیا، جس نے ۱۸۶۱ء میں اپنے بیٹے مہندر سنگھ کے نام پر اسے "مہندر گڑھ" کے نام سے موسوم کر دیا۔

(۸۲) اس کے علاوہ نارنول، بدلی، کنتی اور بندول نامی گاؤں بھی انھیں اس شرط

پر ملے کہ وہ چار سو گھوڑے انگریزوں کو دیں گے۔ " INDEX TO TITLES "
ص ۱۴۸، ایچی سن ، تصنیف مذکور ، حصۂ اول ، ص ۱۰۹، میں یہ تاریخ ۳ مئی
۱۸۰۶ء مطابق ۱۴ صفر ۱۲۲۱ھ درج ہے۔

(۸۳) غالباً یہاں مراد : " تاریخِ جھجر " مصنفہ منشی غلام نبی ، مطبع فیض احمدی ، ۱۸۶۰ء
سے ہے۔

(۸۴) ۱۸۰۸ء۔

(۸۵) ۱۸۰۹ء۔

(۸۶) ۱۸۱۳ء۔

(۸۷) ۱۸۱۳ء " تاریخِ جھجر " مصنفہ منشی غلام نبی کے مطابق ان کا انتقال ۹ ربیع الاول
۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء کو ہوا اور وہ قطب صاحب میں دفن کیے گئے ، ص ۱۶۰۔

(۸۸) متوفی ۱۹ اکتوبر ۱۸۳۵ء " INDEX TO TITLES " ص ۵۹۔

(۸۹) بعد ازاں فیض طلب خاں ٹونک اور جے پور کی مہموں میں انگریز افواج کے
ساتھ شریک ہوئے اور جنرل اختر لونی DAVID OCHTERLONY
(۱۷۵۸ء۔۱۸۲۵ء) ، چارلس مٹکاف ، ولیم فریزر WILLIAM FRASER
(۱۷۸۴ء ۔ ۱۸۳۵ء) اور دہلی کے ریزیڈنٹوں کے راجپوتانے کی سرحد پر امن و
انتظام قائم کرنے میں معاون رہے ۔ ۱۸۲۶ء میں یہ بھرت پور کے محاصرے
میں بھی انگریز فوج کے ساتھ رہے ۔ چارلس ییس ، تصنیف مذکور ، ص ۲۳۔

(۹۰) سید احمد خاں " تذکرۂ اہل دہلی " مرتبہ : قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی
(کراچی ، ۱۹۵۵ء) ص ۵۰۔

(۹۱) یہ حکیم ثناء اللہ فراق کے فرزند تھے ۔ ایضاً

(۹۲) ریاست چھوٹی تھی اس لیے آمدنی افراط سے نہ تھی ۔ دہلی سے اس قطعے کے
قریب ان کی املاک تھی ، جو ان کا بنیادی ذریعۂ آمدنی تھی ۔ جامع مسجد دہلی
کے قریب واقع دریا گنج میں " کالا محل " ان کی ملکیت میں تھا ۔ اسی علاقے
میں فیض بازار ہے ، جو انھی کے نام سے موسوم ہے ۔ ریاست پر مدی نشین

ہونے کے بعد " کلاں محل " کو انھوں نے فروخت کر دیا تھا ، کیوں کہ ان کے خیال میں یہ جگہ پُرشور اور گنجان ہو گئی تھی ۔ نوابزادہ شیر علی خاں تصنیف مذکور ، ص ۱۱۶۔ دلی دروازے سے ایک گلی " جانب کلاں محل معروف بہ " کالا محل " جاتی ہے ، جو نواب فیض طلب خاں بہادر کی ملکیت ہے ۔ یہاں فیض طلب خاں کا مکان رنگ محل وغیرہ اور ان کے زنانے مکانات واقع ہیں ۔ مرزا سنگین بیگ " سیرالمنازل " (دلی ، ۱۹۸۲ء) ص ۲۰۔

(۹۳) ۱۸۲۹ء ، چارلس میسی نے ۱۸۲۷ء تحریر کیا ہے ، تصنیف مذکور ، ص ۲۳۔

(۹۴) مراد ، احاطہ درگاہ حضرت نصیرالدین چراغ دلی ، جو نواحِ دلی میں واقع ہے ۔ اس ۔ مدان کے اولین اکابر یہیں مدفون ہیں ۔ " انھوں نے اس مزار اور گنبد و از سر نو تعمیر کرایا تھا اور یہ ہدایت کی تھی کہ ان کی قبر کسی سنگِ مزار کے بغیر حضرت روشن چراغِ دلی کے مزار میں داخل ہونے کے راستے میں بنائی جائے تاکہ وہاں جانے والے اس جگہ کے اوپر سے پیدل چل کر جائیں ۔ " نوابزادہ شیر علی خاں ، تصنیف مذکور ، ص ۲۱۔

(۹۵) اخبار " دلی گزٹ " کے مطابق دلی کی انگریز حکومت کے ایک تعمیراتی منصوبے میں انھوں نے ایک خطیر رقم سے اس کی مدد کی ۔ بحوالہ : نرائنی گپتا " DELHI BETWEEN TWO EMPIRES 1803-1931 " (دلی ، ۱۹۸۱ء) ص ۱۸۔

(۹۶) چارلس میسی ، تصنیف مذکور ص ۲۴ میں اس بیان کی تائید ملتی ہے ۔

(۹۷) یہ ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۰ء تک منتظم ریاست رہے ۔ جان میکلوڈ ، تصنیف مذکور ، ص ۴۰ ۔

(۹۸) کرنل میکنل (Col McNIEL) ، یہ ۱۸۵۰ء میں بھی دلی کا کمشنر رہا ۔ مٹکاف تصنیف مذکور ، ص ۲۹۔

(۹۹) یہ ۱۸۶۹ء سے ۱۸۰۰ء تک منتظم ریاست رہے ۔ جان میکلوڈ ، تصنیف مذکور ،

کا سنہ ۱۸۶۶ء بتایا ہے جب کہ ایضاً میں ۱۸۶۰ء درج ہے۔ نوری تصنیف مذکور، ص ۶۴ کے مطابق نواب محمد مختار حسین خاں کی عمر کتاب کی تصنیف کے وقت (۱۸۸۰ء میں) ۲۱ برس تھی۔ یہ فارسی اور انگریزی جانتے تھے۔

(۱۰۰) *CRACROFT*، کرنل، دہلی کی تعمیر نو میں اس کی کوشش قابل ذکر بتائی جاتی ہیں۔ نرائنی گپتا، تصنیف مذکور، ص ۸۰۔ ۸۸۔

(۱۰۱) *J. R. OLIVER*، یہ ستمبر ۱۸۵۷ء میں ہندوستان پہنچا تھا۔ اس نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران اپنی یادداشتیں بھی مرتب کیں، جو انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہیں۔ بحوالہ آر سیٹن *R. SETON*

"THE INDIAN MUTINY 1857-58" (لندن ۱۹۸۶ء) ص ۸۱

(۱۰۲) ان کا بیاہ نکاح ہری بیگم دختر نواب شمس الدین خاں (متوفی ۱۸۳۵ء) والی فیروز پور جھرکہ سے ہوا۔ شفیق الرحمن، تذکرۂ شعرائے ... (دہلی ۱۹۰۵ء) ص ۱۳۱۔ ان کی ایک شادی نواب ... نجابت علی خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی، جس کے بطن سے نواب محمد ممتاز حسین خاں پیدا ہوئے۔ چارلس میسی، تصنیف مذکور، ص ۲۳۔

(۱۰۳) ۱۸۷۶ء

(۱۰۴) غالباً ان کا اصلی نام مظہر الحق تھا، جو غالب کے شاگرد اور تذکرۂ مظہر العجائب کے مصنف تھے۔ یہ پاٹودی میں رئیس کے اتالیق بھی تھے، ساتھ ساتھ تحصیل دار بھی ہو گئے تھے۔ ان کے تفصیلی حالات کے لیے: مسلم ضیائی، تذکرۂ مظہر العجائب اور غالب، مشمولہ العلم (کراچی) غالب نمبر، ص ۲۲۔ ۵۳۹، مالک رام، تلامذۂ غالب (دہلی ۱۹۸۴ء) ص ۴۹۵۔ ۴۹۷۔

(۱۰۵) *WILLIAM GEORGE DAVIS* (۱۸۲۸ء۔ ۱۸۹۸ء)

(۱۰۶) چارلس میسی، تصنیف مذکور، ص ۲۳۔ یہ ۱۸۶۸ء سے ۱۸۹۵ء تک منتظم ریاست رہے۔ جان میکلوڈ، تصنیف مذکور، ص ۲۰۔ یہ قبل ازیں نواب جھجر

کی ملازمت میں رہے اور ایک موقعے پر تھامس منکاف نے انھیں ڈپٹی کلکٹر بنا دیا تھا۔ سری رام ماتھر "وقائع سری رام" قلمی، مکتوبہ ۱۹۰۳ء، جلد دوم، ورق ۲۳۶ بحوالہ نرائن گپتا، تصنیف مذکور، ص ۱۸۔

(۱۰۷) " CHIEFS COLLEGE " اس کے قیام اور پس منظر کے لیے: غلام رسول مہر "جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ" (لاہور، ۱۹۶۵ء) ص ۲۱۹۔ ۲۳۳۔

(۱۰۸) نواب ممتاز حسین خاں اس کالج میں ۱۸۸۶ء میں داخل ہونے والے اوّلین طالب علم تھے۔ نوابزادہ شیر علی خاں، تصنیف مذکور، ص ۲۵۔

(۱۰۹) مولوی مخصوص اللہ ۔ شاہ رفیع الدین پسرِ شاہ ولی اللہ کے فرزند ۔ ۱۲۷۳ھ میں انتقال کیا ۔ رحمان علی "تذکرۂ علمائے ہند" (لکھنو، ۱۹۱۴ء) ص ۲۲۳، مُصنّفہ نے نام کا املا مقصوص لکھا ہے ۔

(۱۱۰) ۱۸۶۴ء

(۱۱۱) ۱۸۶۴ء

(۱۱۲) منشی غلام نبی "تاریخِ جھجر" میں صرف پچاس روپے وظیفہ مقرر ہونے کا ذکر ہے، ص ۲۸۹ ۔

(۱۱۳) ۱۸۷۱ء

(۱۱۴) ۱۸۸۱ء

(۱۱۵) JAMES McNabb .

(۱۱۶) غالباً محمد حسین آزاد کی مرتبہ درسی کتابوں کے سلسلے حصۂ اوّل تا چہارم کی طرف اشارہ ہے، جو ۱۸۶۷ء ۔۱۸۶۹ء میں گورنمنٹ بک ڈپو لاہور سے شائع ہوئیں۔

(۱۱۷) غالباً مراد "مختصر تاریخِ ہند" مصنفہ ڈبلیو لتھرج مطبوعہ گورنمنٹ بک ڈپو لاہور ۱۸۷۹ء سے ہے۔

(۱۱۸) اس کتاب کے بارے میں حتمی کچھ معلوم نہ ہو سکا ۔

(۱۱۹) مصنّفہ نذیر احمد دہلوی، مطبوعہ ۱۸۶۹ء

اسنادِ محوّلہ

- آزاد، محمد حسین - نصابِ اردو - حصۂ اوّل تا چہارم (لاہور، ۱۸۶۷ء - ۱۸۶۹ء)
- ابوالفضل - آئینِ اکبری - انگریزی ترجمہ : ایچ۔ بلوخ مین (H. BLOCHMAN)، جلد اوّل (لاہور، ۱۹۷۵ء)
- ارسطو جاہ، منشی سیّد رجب علی خاں بہادر - مختصر حال منشی سیّد رجب علی خاں بہادر - (قلمی) مملوکہ ڈاکٹر گنڈا سنگھ (پٹیالہ)، بحوالہ گنڈا سنگھ
- اسمتھ، وی۔ اے (SMITH, V.A) "THE OXFORD HISTORY OF INDIA" مرتبہ : پرسیول اسپیئر (PERCIVAL SPEAR)، (کراچی ۱۹۸۳ء)
- الطاف علی بریلوی - حیاتِ حافظ رحمت خاں - (کراچی، ۱۹۶۳ء)
- امپیریل گزیٹیر آف انڈیا ("IMPERIAL GAZETTEER OF INDIA") جلد ۲۰ (آکسفورڈ، ۱۹۰۸ء)
- انڈیکس ٹو ٹائٹلز ("INDES TO TITLES") مُرتّبہ : گورنمنٹ ارکائیوز آف انڈیا، دہلی (دہلی، ۱۹۷۹ء)
- الہدیہ چشتی - سیَرالاقطاب - (لکھنؤ، ۱۹۱۳ء) اردو تراجم (۱) سیّد محمد علی جویا مراد آبادی (لکھنؤ، ۱۸۸۸ء)، (۲) معین الدین دردائی (کراچی، ۱۹۷۲ء)
- ایچی سن، سی یو (AITCHISON, C.U) "COLLECTION OF TREATIES, ENGAGEMENTS AND SANADS"، حصۂ اوّل (کلکتہ، ۱۸۹۲ء)
- برجس، جیمز (BURGESS, JEMES) "A CHRONOLOGY OF MODERN INDIA"، (ایڈنبرا، ۱۹۱۳ء)

○ بشیر الدین احمد "واقعاتِ دارالحکومت دہلی" حصّۂ سوم (دہلی ۱۹۹۰ء)
○ بک لینڈ، سی ای (BUCKLAND, CE)
"DICTIONARY OF INDIAN BIOGRAPHY" (لندن ۱۹۰۶ء)
○ بیورج، ہنری (BEVERIDGE, HENRY)
"A COMPREHENSIVE HISTORY OF INDIA" مُرتّبہ: جے پی
گپتا، جلد دوم (دہلی ۱۹۷۴ء)
○ پتمبر سنگھ، "آپ بیتی" (کلکتہ ۱۸۲۰ء)
○ تھیکرز انڈین ڈائرکٹری ("THACKERS INDIAN DIRECTORY")،
(لندن ۱۸۸۸ء ـ ۱۸۹۶ء)
○ "پروسیڈنگز آف دی ٹرائل آف محمد بہادر شاہ ..."
("PROCEEDINGS OF THE TRIALS OF MUHAMMAD
BAHADUR SHAH, TITULAR KING OF DELHI")
(کلکتہ ۱۸۹۵ء)
○ جامی، عبدالرحمٰن "نفحات الانس" (کلکتہ ۱۸۵۸ء)
○ جعفر تھانسیری، محمد ـ "تاریخِ عجیبہ المعروف بہ کالا پانی" (لاہور ۱۸۹۰ء)
○ جہانگیر، نورالدین محمد "تزکِ جہانگیری" انگریزی ترجمہ: ایچ بیوریج
(H BEVERIDGE) اور اے روجرز (A. ROGERS) جلد دوم (لاہور ۱۹۷۵ء)
○ چک، این اے (CHICK, N. A)
"ANNALS OF INDIAN REBELLION" (لندن ۱۸۶۰ء)
○ حسینی، کمال الدین "قیصر التّواریخ" جلد دوم (لکھنؤ ۱۹۰۷ء)
○ حیرت دہلوی، مرزا "چراغِ دہلی" (دہلی ۱۹۸۶ء)
○ دارا شکوہ "سفینۃ الاولیاء" (کانپور ۱۹۰۰ء)
○ دتّا، کالی کنکر "علی وردی خاں اور اس کا عہد" اردو ترجمہ: عبدالاحد خلیل

(دلی ، ۱۹۸۵ء)
دور آفریدی " تاریخ روہیلکھنڈ " (رام پور ، ۱۹۸۰ء)
ڈسٹرکٹ گزیٹر آف لوہارو اسٹیٹ
(" DISIRICT GAZETTEER OF LOHARO STATE ") (لاہور ، ۱۹۱۹ء)
رحمان علی " تذکرۂ علمائے ہند " (لکھنؤ ۱۹۱۴ء)
روہتک ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۸۸۳ ۔ ۱۸۸۴ء
(" ROHTAK DISTRICT GAZETTEER, 1883-1884 ") (لاہور ، ۱۸۸۵ء)
سرکار ، جدو ناتھ " FALL OF THE MUGHAL EMPIRE " جلد دوم
(کلکتہ ، ۱۹۰۰ء)
سکسینہ ، بنارسی پرشاد " HISTORY OF SHAH JAHAN OF DELHI "
(الہ آباد ، ۱۹۶۲ء)
سلیم قریشی " غداروں کے خطوط " (دلی ، ۱۹۹۳ء)
سنگین بیگ ، مرزا " سیر المنازل " مرتبہ شریف حسین قاسمی (دلی ، ۱۹۸۲ء)
سٹین ، آر " THE INDIAN MUTINY 1857-58 " SETON, R.
(لندن ، ۱۹۸۰ء)
سید احمد خاں " تذکرۂ اہل دلی " مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی
(کراچی ، ۱۹۵۵ء)
شاہنواز خاں ، صمصام الدولہ " ماثر الامراء " اردو ترجمہ : محمد ایوب قادری
جلد سوم (لاہور ، ۱۹۷۰ء)
شیر علی خاں ، نوابزادہ " پاکستان اور ہندوستان میں سیاست اور ۔۔۔
روداد " (لاہور ، ۱۹۸۳ء)
عبدالقادر خاں " وقائع عبدالقادر خانی " اردو ترجمہ مرتبہ محمد ایوب قادری ،
جلد اول (کراچی ، ۱۹۶۰ء)
عبداللطیف " ۱۸۵۷ء کا ایک تاریخی روزنامچہ " مرتبہ : خلیق احمد نظامی

(دہلی ۰ ۱۹۵۸ء)

- غالب ۰ اسد اللہ خاں " دستنبو " (لاہور ۰ ۱۹۶۹ء)
- غلام حسین طباطبائی " سیر المتاخرین " انگریزی ترجمہ ۰ جلد دوم (کلکتہ ۰ ۱۷۸۹ء)
- غلام سرور لاہوری " خزینۃ الاصفیاء " جلد اوّل (لکھنؤ ۰ ۱۹۱۴ء)
- غلام نبی ۰ منشی " تاریخ جھجّر " مطبع فیض احمدی ۰ ۱۸۶۶ء
- فرید بکھری ۰ شیخ " ذخیرۃ الخوانین " جلد اوّل (کراچی ۱۹۶۲ء)
- کامل ۰ محمد وارث " تذکرۂ اولیائے لاہور " (کراچی ۰ ۱۹۶۳ء)
- کشن راج بہادر ۰ مہاراج " تاریخ ضلع روہتک " (لاہور ۰ ۱۸۸۴ء)
- " کیفیتِ ریاست جھجّر " (قلمی) مخزونہ : برٹش میوزیم ۰ لندن ۔ OR 1733
- گارسیں دتاسی

"HISTOIRE DE LA LITTERATURE HINDOUIE ET HINDOUSTANIE"

جلد دوم (پیرس ۰ ۱۸۷۱ء)

- گپتا ۰ نرائینی " DELHI BETWEEN TWO EMPIRES, 1803 - 1931 "

(دہلی ۰ ۱۹۸۱ء)

- گریفن ۰ لیپل ایچ (GRIFFEN, LAPELL H)

" THE RAJAS OF PUNJAB " (لندن ۰ ۱۸۷۳ء)

——— اور چارلس میسی (CHARLES MASSY) " تذکرہ رؤسائے

پنجاب " اردو ترجمہ : سیّد نوازش علی (لاہور ۰ ۱۹۹۳ء)

- گنڈا سنگھ " A BIBLIOGRAPHY OF THE PUNJAB " (پٹیالہ ۰ ۱۹۶۶ء)
- گوری شنکر ۔ " چھٹا قلزم " (دہلی ۰ ۱۸۷۹ء)
- گوڑگاؤں ڈسٹرکٹ گزیٹر (" GORGAON DISTRICT GAZETTEER ")

(لاہور ۰ ۱۹۱۱ء)

- لتھراج ۰ ڈبلیو ۔ مختصر تاریخ ہند " (لاہور ۰ ۱۸۷۹ء)
- ماتھر ۰ سری رام ۔ وقائع سری رام " (قلمی) جلد دوم ۰ مکتوبہ ۱۹۰۳ء ۰ بحوالہ

کلکتہ، ہزا تی۔

مالک رام۔ "تلامذۂ غالب" (دہلی، ۱۹۸۴ء)

مٹکاف، تھامس (METCALF, THOMAS)

"TWO NATIVE NARRATIVES OF THE MUTINY AT DELHI"

(ویسٹ منسٹر، ۱۸۹۸ء)

مسلم ضیائی۔ "تذکرۂ مظہر العجائب اور غالب" - مشمولہ "العلم" (کراچی) غالب نمبر، ۱۹۶۹ء۔

مہر، غلام رسول۔ "جنرل سر عمر حیات خاں ٹوانہ" (لاہور، ۱۹۶۵ء)

میر خورد۔ "سیر الاولیاء" (دہلی، ۱۳۰۲ھ) ، و نیز اردو ترجمہ : اعجاز الحق قدوسی (لاہور، ۱۹۸۰ء)

میسی، چارلس (MASSY, CHARLES)

"CHIEFS AND FAMILIES OF NOTE" (الہ آباد، ۱۸۹۰ء)

میکلوڈ، جان (McLEOD, JOHN)

"THE PRINCELY HOUSE OF INDIA AND PAKISTAN"

غیر مطبوعہ صحیفہ ۱۹۸۳ء، مخزونہ : برٹش لائبریری، اورینٹل اینڈ انڈیا آفس کلکشن، یورپی مخطوطہ نمبر (C 365)

مینن، وی پی۔

"THE STORY OF THE INTEGRATION OF THE INDIAN STATES"

(بمبئی، ۱۹۵۶ء)

نجم الغنی۔ "اخبار الصنادید" - جلد اوّل (لکھنؤ، ۱۹۱۸ء)

———۔ "تاریخِ راجگانِ ہند" (لکھنؤ، ۱۹۳۰ء)

نذیر احمد دہلوی۔ "توبۃ النصوح" (دہلی، ۱۸۶۹ء)

نسّاخ، عبدالغفور۔ "خود نوشت سوانح عمری" - مرتبہ : عبدالسّبحان

(کلکتہ ۱۹۸۶ء)

○ نظام الدین احمد ، خواجہ " طبقاتِ اکبری " اردو ترجمہ: محمد ایوب قادری ، جلد ۲ (لاہور ۱۹۹۰ء)

○ نظامی ، خواجہ حسن " دلّی کی سزا " (دہلی ۱۹۴۶ء)

○ نظامی ، مصطفےٰ حسین " تاریخِ روہیلکھنڈ " (بریلی ۱۹۸۶ء)

○ نور احمد چشتی " تحقیقاتِ چشتی " (لاہور ۱۹۶۴ء)

○ واصف ، حفیظ الرحمٰن " تذکرۂ سائل " (دہلی ۱۹۷۵ء)

اشاریہ

(اسمائے اشخاص و اماکن و کتب کا اشاریہ)

اشخاص :—

الف

ب

ن

و

اماکن :—

کتب :—

First Published 1995

Published by
IDARA-E ILMI Hyderabad
Pakistan

Cataloging in Publication Data

Shahr Banu Begam

THE DAYS THAT PASSED Memoirs of a Princess Shahr Banu Begam, daughter of Nawab Akbar Ali Khan the Ruler of Pataudi. Introduced and Edited by Moinuddin Aqeel 1946 --

P cm

Includes bibliography and index

1 Asia, South-Women-19th Century 2 Women-British India-Muslim State 3 British India-Muslim State-Women 4 Urdu Language-Memoirs-Women I Title II Aqeel, Moinuddin 1995

The Daido Foundation Japan (Osaka) has kindly assisted in publication of this book

THE DAYS THAT PASSED

Memoirs of a Princess

SHAHR BANU BEGAM

daughter of Nawab Akbar Ali Khan

The Ruler of Pataudi

Edited with Annotations

by

MOINUDDIN AQEEL

IDARA-E ILMI

Hyderabad, Pakistan